یا اللہ مدد

شانِ رسالت زندہ باد
عقیدہ حیات النبی ﷺ زندہ باد

اصلی کلمہ اسلام: لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

مقامِ صحابہؓ زندہ باد
مقامِ امام اعظم ابو حنیفہؒ زندہ باد

حق چار یارؓ





اکابرین دیوبند، بالخصوص
شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ
کے افکار ونظریات کا بے باک ترجمان

# مجلہ صفدر



بیاد
شیخ الحدیث حضرت مولانا
محمد سرفراز خان صفدر نور اللہ مرقدہ

بفیضان
حضرت مولانا
قاضی مظہر حسین نور اللہ مرقدہ

132/131

جنوری/فروری 2022ء — جمادی الثانیہ/رجب المرجب ۱۴۴۳ھ

اِس لیے معزز قارئین کی خدمت میں ایک تو یہ درخواست ہے کہ جو حضرات ۲۰۱۵ء تا ۲۰۲۰ء کے شمارے مجلد شکل میں حاصل کرنا چاہیں وہ تین صد پچاس (۳۵۰) روپے فی جلد (علاوہ ڈاک خرچ) کے حساب سے منگوا سکتے ہیں۔ دوسری گزارش یہ ہے کہ مجلّہ ''صفدر'' کے سابقہ خصوصاً ابتدائی سالوں کے شمارے جن حضرات کے پاس دستیاب ہوں اور وہ دوسروں کو اُن سے استفادہ کا موقع دینا چاہتے ہوں تو وہ قیمتاً یا چاہیں تو بطورِ عطیہ ہمیں ارسال فرمادیں۔ تیسری گزارش یہ ہے کہ خاص نمبرات خصوصاً امام اہل سنت نمبر، فتنہ غامدی نمبر اور دین پوری نمبر کی دوبارہ اشاعت کے اسباب لیے خصوصی دعا فرمائیں۔ اُمید ہے کہ اِس کارِ خیر میں قارئین ضرور اور بھرپور تعاون فرمائیں گے۔ جو قارئین اپنے پاس موجود کھلے متفرق شمارے بھیج کر دستیاب مجلد شمارے حاصل کرنا چاہیں تو وہ بھی رابطہ فرما سکتے ہیں۔ فی الحال پہلی ترجیح یہ ہے کہ ۲۰۱۴ء تک کے شمارے دستیاب ہوں۔ تاکہ نامکمل جلدوں کی جلد بندی کا عمل مکمل ہو سکے۔






مظہریہ دار المطالعہ جنہان سومرو (سندھ)
0334-4612774 0312 4612774
hamza.ehsani44@gmail.com

دریچہ دِل شیخ الحدیث مولانا حبیب الرحمٰن سومرو مدظلہم [خلیفہ مجاز: حضرت قائد اہل سنتؒ]

# نورِ ایمان کے کمال کا نام احسان ہے

مکان کتنا ہی خوبصورت اور خوش منظر ہو، لیکن جب تک روشنی کا انتظام نہ کیا جائے تو ظلمت ایک ایسا عیب ہے جس کے ہوتے ہوئے دلکش نظارے پھیکے لگتے ہیں۔ روشنی کے نظام کے لیے الگ سے تار اور پاور ہاؤس سے جوڑ کا انتظام کیا جاتا ہے۔

اِسی طرح (انسانی) وجود کو کتنا ہی آراستہ اور مزین کیا جائے، ظاہری خوبصورتی دلکش ہو، اگر اندر نور نہ ہو تو یہ کمالات سے خالی ہوگا۔ روشنی اور نور کا نظام دِل کے وسیع میدان میں ہوتا ہے۔ اور اس کا پاور ہاؤس عالم اَمر ہے جو عالم خَلق سے اوپر ہے۔ جب تک وجود کے تار وتند کو وہاں سے نہ جوڑا جائے، اس کمرے میں ظلمت رہے گی۔ اور "**خَسِرَ الدُّنْیَا وَالآخِرَۃ**" کی مثال ہوگا۔

تعلق کے بعد جب نور دِل کے ذریعہ سے وجود میں پھیلتا ہے تو "**اُولٰئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْن**" کی مثال بنتا ہے۔ نور میں وسعت ہو اور پھیلاؤ میں کمال آئے تو ایمان کامل ہوتا ہے۔ نور ایمان ہے اور کمال کا نام احسان ہے۔ گویا احسان کوئی الگ چیز نہیں بلکہ مراتبِ ایمان کی تکمیل کا نام ہے۔

پھر نور کے معنی جو ظاہر بنفسہ ہو اور مظہر لغیرہ ہو، اس نور کی برکت سے جہاں کا ظلمت کدہ باطن ہو جاتا ہے یعنی چھپ جاتا ہے۔ اور رازِ باطن یعنی حق سبحانہ اور اس کی صفات وتجلیات ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یہی مطلب ہے گہرائی میں جانے کے بعد "**وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ**" کا۔ یعنی جب تک اپنا وجود اور جہاں کا وجود ظلمت کدہ ظاہر ہے۔ تب تلک وہ باطن ہے۔ اور جب اس نور سے ظلمت کدہ ٹوٹ جائے تو وہ ظاہر ہے ؎

جب تلک ہے تُو، نہیں ہے وہ
جب تُو نہیں، تو خود ہے ہو بہو

**اللھم نور قلوبنا بأنوارك القدسية ومح عنا ظلمٰت أبداننا. آمین یارب العالمین، بجاہ النبی الکریم صلی اللہ علیہ وسلم.**

[۱۹/جمادی الاولیٰ ۱۴۴۲ھ......۴/جنوری ۲۰۲۱ء]

☆......☆......☆......☆

یا اللہ مدد

عقیدہ حیات النبی ﷺ زندہ باد

شانِ رسالت ﷺ زندہ باد

اصلی کلمہ اسلام لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

مقام صحابہ زندہ باد

مقام امام اعظم ابوحنیفہ زندہ باد

حق چار یار رضی اللہ عنہم

بیاد

محدث عرب و عجم آبروئے دیوبند امام اہل سنت تلمیذ حضرت مدنی شیخ الحدیث

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر نوراللہ مرقدہ

تلمیذ رشید خلیفہ مجاز

امام الموحدین رئیس المفسرین حضرت مولانا حسین علی نوراللہ مرقدہ

اکابر اہل سنت (دیوبند) بالخصوص شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ

کے افکار و نظریات کا بے باک ترجمان

# مجلہ صفدر

بفیضان

مظہر شریعت و طریقت قائد اہل سنت وکیل صحابہ

حضرت مولانا قاضی مظہر حسین نوراللہ مرقدہ

تلمیذ رشید خلیفہ مجاز

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ

بیاد

مفسر قرآن ولی کامل حضرت مولانا صوفی عبدالحمید خان سواتی نوراللہ مرقدہ

فقیہ العصر ترجمان اہل سنت دیوبند حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی نوراللہ مرقدہ

شیخ المشائخ امام الاولیاء حضرت مولانا خواجہ خان محمد نوراللہ مرقدہ

فخر اہل سنت وکیل صحابہ حضرت مولانا عبداللطیف جہلمی نوراللہ مرقدہ

حکیم العصر شہید اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید نوراللہ مرقدہ

امین ملت مناظر اسلام حضرت مولانا محمد امین صفدر اوکاڑوی نوراللہ مرقدہ

پاسبان مسلک احناف شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد حنیف نوراللہ مرقدہ

ترجمان مسلک اہل سنت دیوبند حضرت مولانا نور محمد تونسوی نوراللہ مرقدہ

وکیل صحابہ حضرت مولانا علامہ علی شیر حیدری شہید نوراللہ مرقدہ

جانشین شہید اسلام محقق العصر سعید احمد جلالپوری شہید نوراللہ مرقدہ

بدعا

وکیل صحابہ حضرت مولانا عبدالستار تونسوی نوراللہ مرقدہ

حکیم العصر شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانوی نوراللہ مرقدہ

سرپرست

پیر طریقت شیخ الحدیث حضرت مولانا

حبیب الرحمن صاحب سومرو

مدظلہ

نگران

وکیل احناف مناظر اسلام حضرت مولانا

مفتی محمد انور اوکاڑوی

صاحب مدظلہ

مدیر اعلیٰ

مولانا جمیل الرحمن عباسی

0301-7790908

مدیر مسئول

مولانا احسن خدامی

0320-4902150

مدیر

حمزہ احسانی

0307-5687800

فی شمارہ 70 زر سالانہ 400

برائے رابطہ: مکان نمبر 4 گلی 82 محمود سٹریٹ محلہ سردار پورہ، اچھرہ لاہور

# ترتیب



## مجلّہ صفدر کے اجراء کا طریقہ

۱- اپنا نام، مکمل ڈاک پتہ، موبائل نمبر اردو میں لکھ کر ارسال فرمائیں۔

۲- کس سن اور ماہ سے رسالہ جاری کرنا ہے، اس کی وضاحت فرمائیں۔

۳- سالانہ زر تعاون مبلغ چار صد (۴۰۰) روپے یا اتنی مالیت کے ڈاک ٹکٹ ارسال فرمائیں۔

۴- منی آرڈر، وی پی، (۱۰، ۱۵/ یا ۲۵/روپے والے) ڈاک ٹکٹ، جاز کیش یا میزان بینک اکاؤنٹ کے ذریعہ رقم ارسال کی جاسکتی ہے۔ رقم بھیجتے وقت تفصیل بتائیں اور بھیج کر اطلاع ضرور فرمائیں، ورنہ ادارہ ذمہ دار نہیں ہوگا۔

۵- رسالہ جاری ہونے پر اپنا خریداری نمبر محفوظ رکھیں!

۶- زر سالانہ ختم ہونے پر اطلاع کے تین ماہ بعد رسالہ کی ترسیل موقوف کر دی جاتی ہے۔ لہٰذا ترسیل جاری رکھنے کے لیے زر سالانہ کی بروقت ادائیگی کو یقینی بنائیں۔ **جزاکم اللہ أحسن الجزاء۔**


مجلّہ صفدر، حمزہ احسانی، مکان ۴، گلی ۸۲، محمود اسٹریٹ، محلہ سردار پورہ، اچھرہ، لاہور

0307-5687800_0334-4612774

وارٹس ایپ: 0312-4612774

سرفراز الحسن خان حمزہ: جاز کیش: 0307-5687800

ای میل: hamza.ehsani44@gmail.com

سرفراز الحسن خان حمزہ......میزان بینک، اچھرہ برانچ، لاہور

acount n: 0104566580......branch cod: 0285

پیام صفدر                                                                 اداریہ

# مجلّہ صفدر: بارھویں جلد کا آغاز اور گزشتہ گیارہ جلدوں کے شمارے

۲۰۰۷ء میں بندہ مادرِ علمی دارالعلوم مدنیہ بہاول پور میں زیرِ تعلیم تھا۔ اُسی سال مجلّہ ''المصطفیٰ'' کے نام سے مادرِ علمی کے ترجمان رسالے کا آغاز ہوا۔ اُستاذِ مکرم مولانا مفتی احمد سفیان مدظلہ سے کسی نے کہہ دیا کہ حمزہ کمپوزنگ جانتا ہے، لہٰذا اُن کے اِرشاد اور اُن کے بعد مدیرِ مجلّہ اُستاذِ مکرم مولانا مفتی محمد یوسف الحسینی مدظلہ کے حکم پر ابتدا میں ''المصطفیٰ'' کی صرف کمپوزنگ و ترتیب کی خدمت شروع کی! پھر رفتہ رفتہ مضامین کی تلاش و دستیابی، انتخاب و ترتیب کے علاوہ طباعت و ترسیل وغیرہ اُمور بھی بندہ کے حوالے ہوتے چلے گئے۔ سرپرست مجلّہ و مدیر جامعہ استاذِ مکرم محسن معظم مربی محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی عطاء الرحمٰن مدظلہم کی سرپرستی، کڑی نگرانی، مشفقانہ تربیت، حوصلہ افزائی اور اعتماد کے سائے میں یہ سلسلہ جاری رہا۔ اللہ پاک نے اِس حوالے سے اپنے اساتذہ کی دعاؤں کی بدولت محنت لگن اور جہدِ مسلسل کی توفیق عطا فرمائی۔ یوں اساتذہ کرام نے بندہ کو تعلیم و تعلم کے ساتھ ساتھ ایک مجلّہ کے حوالے سے بھی عملی تربیت و مشق کے مراحل سے گزرنے کا موقع فراہم کیا۔ **فجزاهم الله خيرا.**

اِسی طرح بہاول پور میں مقیم محبِّ مکرم مولانا جمیل الرحمٰن عباسی مدظلہ کے جاری کردہ مجلّہ ''نورِ بصیرت'' اور ''تسکین الصدور'' کی تیاری و ترتیب میں بھی مقدور بھر خدمت کا موقع گاہے گاہے نصیب ہوتا رہا۔ نیز بعد میں ماہنامہ ''حق چار یار'' لاہور کے دفتر میں محترم ماسٹر منظور حسین صاحب دام ظلہ سے مجلّہ کے حساب کتاب، قارئین کے اندراج، نام اور پتوں کی ترتیب وغیرہ اُمور میں بے پناہ راہ نمائی ملی۔ الغرض مجلّہ ''صفدر'' کی عملی تیاری اور ترتیب و نظم میں جو بھی خوبی ہے وہ مذکورہ بالا حضرات کی راہ نمائی اور تربیت کا نتیجہ ہے۔ اللہ پاک سب حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔ آمین

۲۰۰۹ء میں بندہ کے جدِ مکرم حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ کا سانحہ ارتحال پیش آیا تو مدیرِ المصطفیٰ مولانا مفتی محمد یوسف کی خواہش پر ''امام اہل سنت نمبر'' تیار ہوا۔ اِس طرح بندہ کے مہربان و مشفق اساتذہ نے اپنی نگرانی میں خصوصی اشاعت کی تیاری کا موقع بھی فراہم فرمایا۔ اور بندہ اِس تجربہ سے بھی مستفید ہوا۔

مجلّہ ''المصطفیٰ'' کے ''امام اہل سنت نمبر'' میں بعض اَفکار و شخصیات کے حوالے سے حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ کے موقف کا دوٹوک اِظہار اور چند حقائق کا اعادہ کچھ لوگوں کو گراں گزرا۔ اِس حوالے سے مختلف حضرات کے رویہ اور طرزِ عمل سے بندہ کی حوصلہ شکنی ہوئی اور صدمہ کے باعث عجیب سی کیفیت ہوگئی۔ اِس موقع پر جن حضرات نے تسلی و دلاسہ دیا اُن میں مولانا نور محمد تونسویؒ، مرشدِ گرامی مولانا حبیب الرحمٰن

سومرو مدظلہ، مولانا سعید احمد جلال پوری شہیدؒ، مولانا مفتی جمیل الرحمٰن مدظلہ چکوال، مولانا جمیل الرحمٰن عباسی مدظلہ کے علاوہ استاذِ مکرم مولانا سید علی اصغر شاہ مدظلہ بھی شامل ہیں۔ جنھوں نے ۲۰۱۰ء میں شیخ المشائخ مولانا خواجہ خان محمد رحمہ اللہ کی وفات پر بندہ کو اُن کے حوالے سے خصوصی اشاعت کا فرمایا، اور حکماً کہا کہ آپ نے ضرور شائع کرنا ہے اور اپنے طور پر کرنا ہے۔ اِس طرح اپنے اساتذہ کے حکم پر ہی مجلّہ ''صفدر'' کا اجرا ہوا۔ جس کا پہلا شمارہ ''شیخ المشائخ نمبر'' تھا۔ مجلّہ ''صفدر'' کی مستقل اشاعت کا ارادہ تو چند سال بعد کا تھا، لیکن بعض وجوہات کی بنا پر ۲۰۱۱ء میں ایک شمارہ شائع کرنا پڑا، اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تسلسل کے ساتھ جاری ہوگیا۔

مختلف رسائل وجرائد میں کام کرنے اور اُن کے کارپردازان سے راہ نمائی لینے کے بعد جب مجلّہ ''صفدر'' کی مسلسل اشاعت کا آغاز ہوا تو ہم نے اِس بات کا اہتمام رکھا کہ مجلّے کی کمپوزنگ متفرق مقامات پر محفوظ رہے۔ تاکہ کسی فنی خرابی وغیرہ کی وجہ سے اگر کسی ایک جگہ سے حذف ہوجائے تو دوسرے مقام سے حاصل کی جاسکے۔ نیز ہر شمارے کے چند مطبوعہ نسخے محفوظ رہیں اور سال کے اختتام پر انھیں جلد کروا کر اپنے پاس بطور ریکارڈ رکھا جائے۔ اور یہ ریکارڈ بھی متعدد مقامات پر ہو۔ علاوہ ازیں ہر شمارے کی پی ڈی ایف فائل بنا کر انٹرنیٹ وغیرہ پر نشر کی جائے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ احباب تک پہنچ سکے۔ اور جو شمارہ مضامین ومواد کے لحاظ سے زیادہ اہم ہو، وہ قدرے زیادہ تعداد میں شائع کیا جائے۔ کیونکہ اس کی طلب مسلسل رہتی ہے۔

لیکن کچھ عرصہ بعد جب نئے قارئین نے مجلّہ کے سابقہ شمارے مطبوعہ شکل میں طلب کیے تو یہ فکر پیدا ہوئی کہ سالانہ جلد بندی کے لیے جو شمارے محفوظ کیے جاتے ہیں، وہ ذرا زیادہ تعداد میں رکھے جائیں، تاکہ جو خریدار سال بھر کے رسائل مجلد شکل میں خریدنا چاہیں، وہ بھی حاصل کرسکیں۔ چنانچہ ابتدا میں ہر شمارے کے ۱۰، ۱۵/ اور پھر ۲۵/ نسخے سالانہ جلد بندی کے لیے محفوظ اور سال کے اختتام پر جلد ہوتے رہے۔ اِس طرح بہت سے نئے خریداروں کو گذشتہ تمام شمارے مہیا ہوسکے۔ الحمدللہ!!

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ یہ تعداد کم پڑ گئی۔ لہٰذا اَب اور زیادہ تعداد میں شمارے جلد ہونے لگے۔ لیکن دوسری طرف ابتدائی سالوں کے اکثر شمارے اور چند درمیانی شمارے بالکل ختم اور نایاب ہوگئے، جس کی وجہ سے بعض جلدیں نامکمل رہ گئیں۔ چنانچہ مطلوبہ شماروں کی تلاش شروع ہوئی جو تاحال جاری ہے۔ جہاں کہیں ''صفدر'' کا کوئی سابقہ شمارہ جس حالت میں بھی دستیاب ہوا، حاصل کیا گیا۔ ملک بھر کے طول و عرض سے الحمدللہ کافی شمارے دستیاب ہوئے، یوں ایک مرتبہ پھر سابقہ تمام ریکارڈ قارئین کو مہیا ہونے لگا۔ اور بحمد اللہ بعض لوگوں نے دس سال کا مکمل ریکارڈ حاصل کیا۔ لیکن جو شمارے بے تحاشا تگ و دو اور انتہائی کوشش کے بعد دستیاب ہوئے تھے وہ بھی جلد ہی ختم ہوگئے۔ لہٰذا اَب بارہویں جلد کے آغاز پر ایک مرتبہ پھر اُسی صورتِ حال کا سامنا ہے کہ جلد نمبر ۵/ تا ۱۱ (۲۰۱۵ء-۲۰۲۱ء یعنی سات سال کے شمارے) علاوہ غامدی

نمبر) تو محدود تعداد میں دستیاب ہیں۔ لیکن اس سے پہلے کے شمارے مکمل نہیں ہیں۔ اور ’’علامہ خالد محمود نمبر‘‘ کے علاوہ خاص نمبرات تو بالکل ختم ہیں۔ ریکارڈ کے نسخوں کے علاوہ کوئی ایک نسخہ بھی دستیاب نہیں ہے۔

اِس لیے معزز قارئین کی خدمت میں ایک تو یہ درخواست ہے کہ جو حضرات ۲۰۱۵ء تا ۲۰۲۰ء کے شمارے مجلد شکل میں حاصل کرنا چاہیں وہ تین صد پچاس (۳۵۰) روپے فی جلد (علاوہ ڈاک خرچ) کے حساب سے منگوا سکتے ہیں۔ دوسری گزارش یہ ہے کہ مجلّہ ’’صفدر‘‘ کے سابقہ خصوصاً ابتدائی سالوں کے شمارے جن حضرات کے پاس دستیاب ہوں اور وہ دوسروں کو اُن سے استفادہ کا موقع دینا چاہتے ہوں تو وہ قیمتاً یا چاہیں تو بطورِ عطیہ ہمیں ارسال فرما دیں۔ تیسری گزارش یہ ہے کہ خاص نمبرات خصوصاً امام اہل سنت نمبر، فتنہ غامدی نمبر اور دین پوری نمبر کی دوبارہ اشاعت کے اسباب لیے خصوصی دعا فرمائیں۔ اُمید ہے کہ اِس کارِ خیر میں قارئین ضرور اور بھرپور تعاون فرمائیں گے۔ جو قارئین اپنے پاس موجود کھلے متفرق شمارے بھیج کر دستیاب مجلد شمارے حاصل کرنا چاہیں تو وہ بھی رابطہ فرما سکتے ہیں۔ فی الحال پہلی ترجیح یہ ہے کہ ۲۰۱۴ء تک کے شمارے دستیاب ہوں۔ تاکہ نامکمل جلدوں کی جلد بندی کا عمل مکمل ہو سکے۔ اِسی طرح المصطفیٰ وصفدر کی خصوصی اشاعتیں اگر برائے فروخت کہیں دستیاب ہوں تو ضرور اطلاع فرمائیں۔ ادارہ آپ کے اِس تعاون پر انتہائی شکر گزار اور ممنون ہوگا۔ جزاکم اللہ خیرا۔ مجلد شمارہ جات کی ترتیب درج ذیل ہے:

| جلد | شمارہ نمبر | جلد | شمارہ نمبر |
|---|---|---|---|
| ۱ | چار تا دس (۴-۱۰) | ۲ | گیارہ تا اکیس (۱۱-۲۱) |
| ۳ | چھبیس تا چونتیس (۲۶-۳۴) | ۴ | پینتیس تا چھیالیس (۳۵-۴۶) |
| ۵ | سینتالیس تا اٹھاون (۴۷-۵۸) | ۶ | اُنسٹھ تا ستر (۵۹-۷۰) |
| ۷ | اکہتر تا بیاسی (۷۱-۸۲) | ۸ | تراسی تا چورانوے (۸۳-۹۴) |
| ۹ | پچانوے تا ایک سو چھ (۹۵-۱۰۶) | ۱۰ | ایک سو سات تا ایک سو اٹھارہ (۱۰۷-۱۱۸) |

خصوصی نمبرات:

| عنوان | شمارہ | عنوان | شمارہ |
|---|---|---|---|
| شیخ المشائخ نمبر (بیاد: خواجہ خان محمدؒ) | ۱ | شیخ الحدیث نمبر (بیاد: مولانا حنیفؒ) | ۲۲-۲۵ |
| دین پوری نمبر (بیاد: مفتی عبد المجیدؒ) | ۳۶ | فتنہ غامدی نمبر | ۵۲ |
| علامہ ڈاکٹر خالد محمود نمبر | ۱۱۹-۱۲۷ | | |

☆......☆......☆......☆

مولانا جمیل الرحمٰن عباسی

# حضرت سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ

حضرت سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کا نام عامر بن عبداللہ بن الجراح رضی اللہ عنہ ہے، آپ کی کنیت ابوعبیدہ ہے، کنیت سے زیادہ مشہور ہیں اور اپنے دادا جراح کی طرف منسوب ہیں، چنانچہ ابوعبیدہ بن الجراح کے نام سے شہرت رکھتے ہیں۔

آپ کے والد عبداللہ بن الجراح نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور معرکہ بدر میں مشرکین کی طرف سے شریک ہوئے تھے، شمشیر زنی کے دوران وہ اپنے بیٹے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے قتل کے درپے ہوئے، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ان سے کنارہ کشی کرتے رہے مگر جب وہ اپنے خطرناک اور قبیح ارادہ سے باز نہ آئے تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اپنی تلوار سے اپنے والد کا سر قلم کر دیا اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی: **لاتجد قوما یؤمنون باللہ والیوم الآخر یوادون من حاد اللہ ورسولہ.** (سورۃ المجادلہ آیت ۲۲)

ترجمہ: ’’جو لوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں آپ ان کو نہ دیکھیں گے کہ وہ ایسے شخصوں سے دوستی رکھیں جو اللہ اور اس کے رسول کے برخلاف ہیں گو وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا کنبہ ہی کیوں نہ ہو‘‘ (ترجمہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ)

البتہ آپ رضی اللہ عنہ کی والدہ امیمہ بنت غنم رضی اللہ عنہا اسلام کی دولت سے بہرہ ور ہوئیں اور صحابیہ ہونے کا اعزاز پایا۔ (الاصابہ ج ۲ ص ۹۷۸، اسد الغابۃ ج ۲ ص ۱۵۲)

حضرت ابوعبیدہ اس وقت دامن نبوی سے وابستہ ہو گئے جبکہ ابھی تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دار ارقم کو بھی اپنا مرکز نہیں بنایا تھا، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح، حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب اور حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہم اجمعین ایک ہی ساتھ اسلام لائے، حضرت ابوعبیدہ کو ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ دونوں کی سعادت حاصل ہوئی، جن دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی مجلس میں جنت کی بشارت دی ان میں ایک بڑا نام حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا ہے، آپ کو غزوہ بدر اور بعد کے تمام غزوات میں شرکت کی فضیلت حاصل ہے، غزوہ احد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ انور میں گھس جانے والے خود کے دو حلقے حضرت ابوعبیدہ نے ہی نکالے تھے جس میں انھیں بڑی قوت صرف کرنا پڑی تھی اور ان کے سامنے والے دو دانت اکھڑ گئے تھے جن کے نکل جانے سے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا چہرہ

مزید خوبصورت ہوگیا۔(اسد الغابہ ج۲ص۱۵۱)

فیقال انہ ما رؤی اھتم قط احسن من ھتم ابی عبیدۃ. "جن لوگوں کے سامنے والے دانت اکھڑ گئے ہوں ان میں سے حضرت ابوعبیدہؓ سے بڑھ کر کسی کو خوبصورت نہیں دیکھا گیا۔

(الاستیعاب:۳۹۸)

مدینہ منورہ میں مواخات کے وقت آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوعبیدہؓ اور حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کو باہم بھائی بنایا تھا، ملک شام ودمشق کی فتوحات میں حضرت ابوعبیدہؓ کا نمایاں کردار ہے، حضرت سیدنا فاروق اعظمؓ نے خلافت سنبھالنے کے بعد حضرت سیدنا خالد بن ولیدؓ کو معزول کر کے حضرت سیدنا ابوعبیدہؓ کو امیر عساکر اور افواج کا سپہ سالار بنادیا تھا، اسی موقع پر حضرت خالد بن ولیدؓ نے فرمایا "تم لوگوں پر اس امت کے امین حاکم ہوئے ہیں" اور حضرت ابوعبیدہؓ نے فرمایا "میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ خالد اللہ تعالیٰ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہیں" (حوالہ بالا)

☆......حضرت سیدنا عمر بن خطابؓ جب بیت المقدس تشریف لے گئے تو لشکر کے سرداروں اور معززین نے آپ سے ملاقات کی، حضرت عمرؓ نے پوچھا این اخی ابو عبیدہ میرے بھائی ابوعبیدہ کہاں ہیں؟ پھر حضرت ابوعبیدہؓ تشریف لائے تو حضرت عمرؓ ان کے ساتھ ان کے گھر تشریف لے گئے فلم یر فیه شیئا الا سیفه و ترسه "گھر میں تلوار اور ڈھال کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔" (الاصابہ ج۲ص۹۷۹)

☆......نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ابو عبیدۃ بن الجراح فی الجنة ابوعبیدہ جنتی ہیں۔

(مشکوۃ ص۵۷۴ بحوالہ ترمذی)

☆......حضرت انس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لکل امة امین و امین ھذہ الامة ابو عبیدۃ بن الجراح ہر امت کا امین ہوتا ہے میری امت کے امین ابوعبیدہ بن الجراح ہیں۔

(مشکوۃ ۵۷۳ بحوالہ بخاری ومسلم)

☆......حضرت عائشہؓ سے سوال کیا گیا کہ اگر رسول اللہ ﷺ کسی کو اپنے بعد خلیفہ نامزد کرتے تو کس کو نامزد کرتے؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا ابوبکرؓ کو، کہا گیا ابوبکر کے بعد آنحضرت ﷺ کس کو خلیفہ منتخب فرماتے؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا عمرؓ کو قیل من بعد عمر قالت ابو عبیدۃ بن الجراح پوچھا گیا حضرت عمرؓ کے بعد حضور ﷺ کس کو خلیفہ مقرر فرماتے؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا ابوعبیدہ بن الجراح کو۔

(مشکوۃ شریف ص۵۷۳ بحوالہ مسلم شریف)

☆......حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ نجران کا وفد آنحضرت ﷺ کے پاس آیا اور کہا یا رسول اللہ ابعث الینا رجلا امینا ہمارے ساتھ ایک امانت دار مرد (تعلیم وامارت) کے لیے بھیجئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا لابعثن الیکم رجلا امینا حق امین میں تمھارے ساتھ ایسا امین بھیجوں گا کہ اس جیسا کیا کوئی امین ہوگا۔ اس وقت بہت سے لوگ امارت کی توقع رکھنے لگے پھر آنحضرت ﷺ نے حضرت سیدنا ابوعبیدہؓ بن الجراح کو اہل نجران کے ساتھ روانہ فرمایا (مشکوۃ شریف ۵۷۵ بحوالہ بخاری ومسلم)

☆......حضرت ابوبکرؓ صدیق نے سقیفہ کے دن فرمایا تھا لقد رضیت لکم احدالرجلین فبایعوا ایھما شئتم عمر وابوعبیدۃ بن الجراح میں ان دو آدمیوں میں سے کسی ایک (کی خلافت) کو تمھارے لیے بہتر سمجھتا ہوں ایک عمر بن خطاب دوسرے ابوعبیدہ بن الجراحؓ۔ (الاستیعاب ص ۳۹۸)

☆......حضرت ابوعبیدہؓ پر خوف خدا اس قدر غالب تھا کہ وہ فرماتے تھے کہ کاش میں راکھ ہوتا کہ آندھی اور ہوا مجھے اڑا لے جاتی۔ کبھی فرماتے کاش میں مینڈھا ہوتا لوگ میرا گوشت کھا جاتے اور شوربا پی جاتے یعنی کوئی ایسی صورت ہوتی کہ آخرت کے حساب سے بچ جاتا (اسدالغابہ ج۲ ص ۱۵۱)

☆......عمواس کے تاریخی طاعون میں ۱۸ھ میں سرزمین اردن میں فحل نامی جگہ حضرت ابوعبیدہؓ کا انتقال ہوا، اس وقت آپ کی عمر ۵۸ سال تھی (الاصابہ ج۲ ص ۹۷۹)

حضرت ابوعبیدہؓ کی زندگی کے آخری ایام کا ایمان افروز واقعہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ کے قلم سے ملاحظہ ہو:

جب اردن اور شام میں وہ تاریخی طاعون پھیلا جس میں ہزاروں افراد لقمہ اجل بنے تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو ایک خط لکھا جس کے الفاظ یہ تھے:

''سلام کے بعد مجھے ایک ضرورت پیش آ گئی ہے جس کے بارے میں آپ سے زبانی بات کرنا چاہتا ہوں، لہٰذا میں پوری تاکید کے ساتھ آپ سے کہتا ہوں کہ جونہی آپ میرا یہ خط دیکھیں تو اسے اپنے ہاتھ سے رکھتے ہی فوراً میری طرف روانہ ہو جائیں۔''

حضرت ابوعبیدہ اطاعت امیر کے ساری زندگی پابند رہے لیکن اس خط کو دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ حضرت عمرؓ کی یہ شدید ضرورت (جس کے لیے مجھے مدینہ منورہ بلایا ہے) صرف یہ ہے کہ وہ مجھے اس طاعون زدہ علاقے سے نکالنا چاہتے ہیں چنانچہ یہ خط پڑھ کر انھوں نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا:

''میں امیر المؤمنین کی ضرورت سمجھ گیا وہ ایک ایسے شخص کو باقی رکھنا چاہتے ہیں جو باقی رہنے والا نہیں۔''

یہ کہہ کر حضرت عمرؓ کو یہ جواب لکھا!

''امیر المؤمنین! آپ نے مجھے جس ضرورت کے لیے بلایا ہے وہ مجھے معلوم ہے، لیکن میں مسلمانوں کے ایسے لشکر کے درمیان بیٹھا ہوں جس کے لیے میں اپنے دل میں اعراض کا کوئی جذبہ نہیں پاتا، لہٰذا میں ان لوگوں کو چھوڑ کر اس وقت تک آنا نہیں چاہتا جب تک اللہ تعالیٰ میرے اور ان کے بارے میں اپنی تقدیر کا حتمی فیصلہ نہیں فرما دیتا، لہٰذا امیر المؤمنین! مجھے اپنے تاکیدی حکم سے معاف فرما دیجئے اور اپنے لشکر ہی میں رہنے دیجئے''۔

حضرت عمرؓ نے خط پڑھا تو آنکھوں میں آنسو آ گئے، جو لوگ پاس بیٹھے تھے وہ جانتے تھے کہ خط شام سے آیا ہے، حضرت عمرؓ کو آبدیدہ دیکھ کر انھوں نے پوچھا کیا ابو عبیدہ کی وفات ہوگئی؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا ہوئی تو نہیں۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ ہونے والی ہے، اس کے بعد حضرت عمرؓ نے دوسرا خط لکھا:

''سلام کے بعد! آپ نے لوگوں کو ایسی زمین میں رکھا ہوا ہے جو نشیب میں ہے، اب انھیں کسی بلند جگہ پر لے جائیے جس کی ہوا صاف ستھری ہو''

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ خط حضرت ابو عبیدہؓ کو پہنچا تو انھوں نے مجھے بلا کر کہا کہ امیر المؤمنین کا یہ خط آیا ہے، اب آپ ایسی جگہ تلاش کیجئے جہاں لے جا کر لشکر کو ٹھہرایا جا سکے، میں جگہ کی تلاش میں نکلنے کے لیے پہلے گھر پہنچا تو دیکھا کہ میری اہلیہ طاعون میں مبتلاء ہو چکی ہیں، میں نے واپس آ کر حضرت ابو عبیدہ کو بتایا اس پر انھوں نے خود تلاش میں جانے کا ارادہ کیا اور اپنے اونٹ پر کجاوہ کسوایا، ابھی آپ نے اس کی رکاب میں پاؤں رکھا ہی تھا کہ آپ پر بھی طاعون کا حملہ ہو گیا اور اسی طاعون کے مرض میں آپ نے وفات پائی۔ البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۷۸۔ (جہانِ دیدہ ص ۱۹۲)

آخر میں حضرت ابو عبیدہؓ کی ایک زریں نصیحت ملاحظہ ہو، فرمایا اَلا رب مبیض لثیابه وهو مدنس لدينه ،اَ لَا رب مكرم لنفسه وهو لها مهين غدا ادفعوا السيئات القديمات بالحسنات الحادثات ''غور سے سن لو بہت سارے لوگ کپڑوں کو سفید رکھنے والے ہوتے ہیں اور دین کو میلا کرنے والے ہوتے ہیں اور بہت سے لوگ اپنے نفس کو معزز بنائے ہوئے ہوتے ہیں اور قیامت کے دن اس نفس کو ذلیل کرنے والے ہوں گے ماضی کے گناہوں کو نیکیوں کے ذریعے مٹاتے رہو۔ (الاصابہ ج ۲ ص ۹۷۹)

رضی الله تعالیٰ عنه وارضاه

☆......☆......☆......☆

انجم نیازی

# سیّدنا ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ

زمیں پر لیٹتا جب فوج کا سالار خیمے میں
سمٹ آتی تھی ساری خُلد کی مہکار خیمے میں

عمرؓ بھی رو پڑے تھے دیکھ کر اُس کے اثاثے کو
زرہ بکتر پڑی تھی اور اِک تلوار خیمے میں

لڑائی کی تھکاوٹ دُور کرنے کے لیے شب بھر
عبادت میں مگن رہتا نبیؐ کا یار خیمے میں

فرشتے جب کبھی آتے زیارت کرنے کی خاطر
نئی دنیا نظر آتی انہیں ہر بار خیمے میں

ہلا دیتے تھے اُس کے فیصلے باطل کی دیواریں
لگا رہتا تھا اُس دُرویش کا دربار خیمے میں

پلنگ تو اِک طرف سونے کو بستر بھی نہ تھا انجم
نرالی شان سے رہتا تھا وہ سردار خیمے میں

☆......☆......☆......☆

مرتب: مولانا مفتی شعیب احمد — مجلس: ۹

# المجالس الحسنه

مجالس: مولانا مفتی محمد حسن مدظلہم [خلیفہ مجاز: حضرت امام اہل سنتؒ]

13/ دسمبر 2013ء/ ۱۰/ صفر الخیر ۱۴۳۵ھ، بوقت صبح، درسِ بخاری شریف

## جنازے میں شرکت کی برکت

حدیث آئی "امرنا رسول الله بسبع و نهانا عن سبع" جس میں جنازے میں شرکت، مریض کی عیادت وغیرہ کا تذکرہ تھا۔ حضرت نے فرمایا:

جنازے میں شرکت کرنی چاہیے۔ بعض دفعہ جنازہ اتنا بابرکت ہوتا ہے کہ شرکت کرنے والوں کی بخشش ہو جاتی ہے۔ جیسے حضرت خواجہ خان محمد صاحب رحمہ اللہ کے جنازے کے بعد ایک صاحب نے خواب دیکھا کہ شرکت کرنے والوں کی مغفرت کر دی گئی۔

پھر فرمایا: بشارات شوق کو بڑھانے کے لیے ہوتی ہیں نہ کہ ٹھنڈا کرنے کے لیے۔

## موت کھڑے کھڑے آ رہی ہے:

پھر فرمایا: ابھی رات مولانا خلیل الرحمٰن زاہد صاحب کا جنازہ تھا، جب ہم جامعہ مدنیہ میں تجوید پڑھتے تھے تو وہ بھی پڑھتے تھے، کل مغرب کے بعد طبیعت خراب ہوئی اور عشاء سے پہلے انتقال بھی ہو گیا۔ موت کا کیا پتہ کھڑے کھڑے آ جاتی ہے۔

## عیادت اور اس کا ادب

فرمایا: یہاں گلاب دیوی ہسپتال ہے، وہاں ایک صاحب صبح صبح تمام مریضوں کی عیادت کرتے تھے، کسی کو جانتے ہوں نہ جانتے ہوں، مختصر مختصر سب کو سلام دعا اور حال دریافت کرتے تھے، اور کبھی کبھی اپنی اجرت سے بچا کر کوئی چیز بھی خرید کر لے جاتے تھے۔

پھر فرمایا: عیادت مختصر کرنی چاہیے، یہ ادب ہے۔ میں کراچی میں تھا وہاں ایک بھائی کہنے لگے: "ادب ہر عمل کو ہار پہنانے کا نام ہے۔"

ایک دفعہ جب راستے میں جاتے ہوئے حادثہ پیش آیا اور سر میں چوٹ لگی، اگرچہ تکلیف تو تھی لیکن اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں کتنی حکمتیں ہوتی ہیں، "خوشبو والا عقیدہ" کتاب کا کام کتنے دنوں سے رہ رہا تھا، اسفار کی وجہ سے وقت نہیں مل پا رہا تھا کہ ان دنوں میں اللہ تعالیٰ نے وہ کام لے لیا۔ بعض ساتھیوں نے ہمت کی اور نہ

جانے کہاں کہاں سے تقاریظ اکٹھی کرلیں، میرے سے اتنا کچھ کہاں ہو سکتا تھا۔

فرمایا: ’’خیر کا کوئی سلسلہ ہو، پتہ نہیں محبت کے کتنے دھکے لگتے ہیں، تو پھر وجود میں آتا ہے۔‘‘

بھائی مولانا عثمان صاحب ہیں مولانا عمار صاحب ہیں پرانے ساتھی ہیں۔ ’’الصرف العزیز‘‘ ہے ’’علامات نحویہ‘‘ ہے کتنے ساتھیوں کی محنتیں اور کوششیں ہیں۔ اللہ قبول فرمائے۔

جب چوٹ لگی تو حضرت مولانا محمود میاں صاحب دامت برکاتہم العالیہ گھر پر عیادت کے لیے تشریف لائے تو بمشکل دو سے چار منٹ تک بیٹھے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ بیمار ہوئے تو ایک صاحب عیادت کے لیے آگئے اور بہت زیادہ دیر کردی۔ حضرت نے اشارے کنائے میں فرمایا کہ لوگوں کو خبر نہیں عیادت کے لیے آتے ہیں اور بیٹھے رہتے ہیں، وہ صاحب بجائے اس کے کہ اپنی طرف اشارے کو سمجھتے، کہنے لگے حضرت دروازے کو کُنڈی لگا دوں؟ تا کہ کوئی آ نہ سکے۔ حضرت نے فرمایا: ہاں ہاں لگا دو مگر باہر سے لگا دو۔ [اس پر مجلسِ درس کشتِ زعفران بن گئی]۔

<u>دعوت قبول کرنا</u>

دعوت کے قبول کرنے پر فرمایا:

مولانا عبدالقادر صاحب مدینہ منورہ والے فرماتے ہیں:

**”ادخال السرور فی قلب المؤمن من اعظم الطاعات“**

کسی مسلمان کا (شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے) دل خوش کرنا ایک بڑی نیکی ہے۔

اس لیے اگر کوئی عارضہ نہ ہو تو دعوت قبول کرنی چاہیے، بلکہ ولیمہ کی دعوت کو تو واجب لکھا ہے۔

یہاں یاسر ہوٹل والے ہوتے تھے۔ دس پندرہ سال پہلے کی بات ہے وہ کہتے تھے آپ کو اپنی جگہ بلا کر کھانا کھلائیں گے، لیکن میں تکرار میں لگا رہتا تھا۔ پھر ایک دن وہ کڑاہی بھر کر لے آئے، اس سے اندازہ ہوا کہ ان کو محبت ہے اور کھلانے کو سعادت سمجھتے ہیں، اس کے بعد ایک آدھ دفعہ ان کے پاس بھی چلے گئے۔

<u>طلبہ کی دعوتیں</u>

عام طور سے کھانے پینے کی دعوت کے لیے وقت کم ہی نکلتا ہے ہاں کوئی دین کی بات کہنے سننے کا موقع ہو تو الگ بات ہے۔ مدرسے میں طلبہ جو دعوتیں کرتے ہیں میرا اس میں بھی معمول ہے کہ شریک نہیں ہوتا۔ یہاں طلبہ کو سختی سے منع کر رکھا ہے کہ ایسی اجتماعی دعوتیں نہ کیا کریں۔ بیچارے کچھ غریب طلبہ بھی ہوتے ہیں جو بیچارے قرض وغیرہ لے کر اپنی عزت نفس کے لیے پیسے ڈال دیتے ہیں، بعض سے تو مجبور کر کے لیے جاتے

ہیں۔

سلام کے آداب

فرمایا: سلام کی تین قسمیں ہیں: (۱) سلامِ استیذان، (۲) سلامِ لقاء، (۳) سلام وداع۔

سلام کے مکروہ مواقع بھی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ مسلم علیہ [یعنی جن کو سلام کیا جارہا ہے ان] کا حرج ہو جیسے نماز، تلاوت اور ذکر کے وقت۔ ایک دفعہ میں اپنے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، اذان ہو رہی تھی میں نے سلام کیا۔ چونکہ اصلاحی تعلق تھا حضرت نے فوراً اصلاح کی اور فرمایا: اذان کے وقت سلام نہیں کرتے۔

اسی طرح بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جن میں سلام کی بے توقیری ہوتی ہے جیسے قضائے حاجت وغیرہ کے موقع پر سلام کرنا۔

ہیلو کی جگہ بھی سلام کرنا چاہیے۔ ایک میواتی کو فون آیا، فون کرنے والے نے کہا: ''ہیلو'' تو وہ ہلنا شروع ہو گیا پھر کہا ''ہیلو'' وہ اور ہلنے لگا، تیسری دفعہ اور زور سے ہلنے لگا، چوتھی دفعہ کہا تو آگے سے بولا: میں ہل ہل کے تھک گو کہاں تک ہلائے گو موئے۔ (میں ہل ہل کر تھک گیا ہوں، کہاں تک ہلاؤ گے مجھے!)۔

مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ: ہیلو ایک مہمل لفظ ہے۔

حدیث شریف تو خانقاہی سبق ہے

سبق کے آخر میں فرمایا: میرے عزیز! دورہ (حدیث شریف) پڑھنے کی نہیں پینے کی چیز ہے۔ باقی امتحان کی تیاری خود کر لینا۔ دل میں اگر یہ جذبہ داخل ہو گیا تو قطرہ بھی سمندر ہے۔ میں عرض کرتا رہتا ہوں:

''اگر پرچے میں حدیث آئی: ''المسلم من سلم المسلمون من لسانه و يده.'' آپ نے اعراب صحیح لگا دیے، ترجمہ بھی کر دیا، تشریح بھی لکھ دی، اعتراض کا جواب بھی کر دیا، پرچہ پورا حل کر دیا، ممتحن نے نمبر بھی پورے لگا دیے، لیکن عرش پر نمبر تب لگیں گے جب زبان غیبت سے بچے، جھوٹ سے بچے، چغل خوری سے بچے۔ یہ کام بھی کرنے کا ہے۔ میں عرض کروں۔ حدیث شریف کا سبق تو خانقاہی سبق ہے۔ یہی تو وہ فرامین تھے جنہوں نے صحابہ کے قلوب کو، مزکی، مجلی، مطہر اور منور کیا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد کتنی تھی! ہمارے چوبرجی کے علاقے کی آبادی کی تعداد ان کی کل تعداد سے زیادہ ہے، لیکن ان میں سے ہر صحابی ہدایت کا چراغ اور روشنی کا مینار تھا۔

☆......☆......☆......☆

مولانا مفتی عبیدالرحمٰن، مردان

# فضائل ومناقب کی روایات اور ان کے متعلق اعتدال کا رویہ

## فضائل ومناقب کی اہمیت:

دینِ اسلام کی شکل میں جس عظیم نعمت و دولت سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں نوازا ہے، اس کا ایک اہم حصہ فضائل ومناقب بھی ہے۔ کسی عمل کی کیا فضیلت ہے یعنی اس کے کرنے پر کیا کچھ اجر وثواب حاصل ہوگا اور آخرت میں اس پر کیا کچھ اثرات و برکات مرتب ہوں گے؟ اس کو فضائل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان باتوں کا امت مرحومہ تک پہنچانا اس بھاری بھرکم امانت اور ذمہ داری کا حصہ ہے جس کو حضرت رسول اللہ ﷺ نے نہایت ہی احسن واکمل طریقے اور بڑے ہی مناسب انداز واسلوب میں نبھایا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر پاک باز انسانیت کے ایک بحر بیکراں نے بیک وقت اس بات کی گواہی دی جس پر آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو گواہ بنایا۔

فضائل کے نصوص وروایات کے بہت سے فوائد میں سے ایک اہم اور اساسی فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے عمل کی رغبت اور نیکی کا شوق وطلب پیدا ہوتا ہے اور یہی شوق وطلب کسی فلسفے اور دین کے زندہ جاوید رہنے کا سبب ہے، جب تک کسی دین ومذہب میں شوق وطلب کے اسباب ومواقع موجود ہوں اور وہ لوگوں کی توجہ ودلچسپی کو اپنی اندر استقامت کے ساتھ برقرار رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو، تب تک وہ دین ومذہب انسانیت کے دل ودماغ پر چھایا ہوا ہوتا ہے اور جس حد تک یہ چیزیں کمزور یا مفقود ہوں اسی حد تک فکر ودین انسانیت پر حکمرانی کے بجائے قصہ پارینہ بن جاتا ہے۔

## فضائل بیان کرنے میں کوتاہیاں

نصوص کا جو ذخیرہ فضائل ومناقب پر مشتمل ہو اور اسنادی لحاظ سے اس پر کوئی قدغن نہ ہو، اس کو اہتمام وتوجہ سے لینا اور شاہراہ انسانیت کو اس سے واقف کرانا نہایت مفید بلکہ ایک حد تک ضروری ہے کہ یہ بھی درحقیقت اسی دین متین کا ایک حصہ ہے جس کی تلقین وتبلیغ کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ لیکن ساتھ دوسری طرف غور کیا جائے تو انہی فضائل ومناقب کو بسا اوقات زبان وبیان کے ایسے سانچوں میں ڈھالا جاتا ہے جس سے امت کی نظریاتی وعملی دنیا میں بحران سا پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد اس کی حیثیت اسی تند وتیز

تلوار کی سی بن جاتی ہے جس کا نوک خود استعمال کرنے والے کی طرف ہو اور وہ دشمن پر وار کرنے کے بعد اس کو اپنی طرف زور سے کھینچ کر اپنے ہی موت کا سامان کرے۔ یہاں ایسے ہی کچھ کوتاہیوں کو ذکر کرنا مقصود ہے تاکہ ٹھنڈے دل سے اس کے اثرات ونتائج پر غور کیا جاسکے اور یہ اثراتِ بد اگر واقعی ہوں تو ابھی سے اس کی تلافی کا انتظام کرنے کی کوشش کی جائے۔

## پہلی کوتاہی: تحقیق کے بغیر فضائل سنانا

فضائل ومناقب کے متعلق روایات کا خاصا ضخیم حصہ وہ ہے جو حضرات محدثین کرام کی تحقیق کے مطابق پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتا بلکہ ضعیف کہلاتا ہے جس سے کوئی شرعی حکم ثابت نہیں ہوسکتا۔ پھر ان ضعیف روایات میں سے بھی ایک وافر حصہ موضوعات کا ہے یعنی من گھڑت اور خود ساختہ قسم کی باتیں جو حضور نبی اکرم ﷺ کی طرف غلط طور پر منسوب کی گئیں ہیں جن کے بارے میں یہ طے ہے کہ ایسی کسی روایت کی نسبت حضور ﷺ کی طرف ہوسکتی ہے اور نہ ہی موضوع ہونے کی وضاحت کے بغیر اس کی نشر واشاعت درست ہے۔ ہمارے ہاں دیگر ابواب کی طرح فضائل ومناقب کے باب میں اس کی بہت بہتات ہے اور بلا مبالغہ سینکڑوں ایسی روایات بیان کی جاتی ہیں جو اسنادی لحاظ سے موضوع ہوتی ہیں اور ضعیف روایات کی تعداد تو اس سے کئی گناہ زیادہ ہے۔

یاد رہے کہ حضرات محدثین کے نزدیک اگرچہ ہر ضعیف روایت کے نقل وبیان کے ساتھ ضعف کی تصریح لازم نہیں ہے اور احکام شرعیہ کے علاوہ فضائل ومناقب کے باب میں کسی حد تک ایسی روایات کارآمد بھی ہوجاتی ہیں لیکن اس کے لئے جو کڑی اور مفید شرائط حضرات محدثین کرام نے لگائی ہیں، اس کا عام طور پر پوری طرح لحاظ نہیں رکھا جاتا اور اسی وجہ سے اس غلطی کا ارتکاب ہو ہی جاتا ہے جس سے بچنے کے لئے شرائط تجویز فرمائی گئی تھیں۔ نیز عام ذہن کے افراد سے ان شرائط کی پوری پابندی کی توقع رکھنا بظاہر بڑا مشکل ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات اس کا صحیح طور پر سمجھانا ہی مشکل ہوجاتا ہے چنانچہ ان ہی شرائط میں سے ایک ضروری شرط یہ ہے کہ: ''عمل کرتے وقت اس خاص فضیلت کے ثبوت کا اعتقاد نہ رکھا جائے۔'' اب یہ شرط کتنی باریک بینی پر مبنی ہے اور کس قدر اس کی اہمیت ہے؟ اور اس سے غفلت برتنے کی تقدیر پر کیا خرابی آئے گی؟ اس کو حضرات اہل علم خوب سمجھتے ہیں، لیکن دین کے اُصول اور ان کے حدود وقیود سے نابلد ذہن کے افراد کو اوّلاً تو یہ سمجھانا خاصا مشکل کام ہے اور پھر ان کے متعلق یہ باور کرنا، کہ واقعۃً عملی طور پر وہ اِس شرط کی پوری پابندی کریں گے، نتیجہ خیز نہیں ہوتا۔

ہمارے ہاں ایسی بہت سی روایات عام مجمع میں بیان کی جاتی ہیں اور لوگوں کو ان روایات واخبار کی بنیاد پر مختلف اعمال کی ترغیب دی جاتی ہے، ایسا کرنا اگرچہ اکثر اخلاص ہی پر مبنی ہوتا ہے اور نہ ہو تو بھی ہمیں حسن ظن ہی کا حکم دیا گیا ہے، لیکن اسی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ لوگ اس کو احادیث وروایات ہی باور کرنا شروع کرتے ہیں اور اس میں جو فضیلت ذکر کی جاتی ہے، اس کو بھی حضور ﷺ کی بات کے طور پر سمجھنے لگ جاتے ہیں اور اگر کسی کو اس کے مطابق عمل کرنے کی توفیق ملتی ہے تو وہ اسی تصور واعتقاد کے مطابق عمل کرتا ہے کہ حدیث میں اس عمل کی یہ فضیلت ذکر کی گئی ہے۔ اب عملی طور پر تو بظاہر ایک نیک کام پر عمل کیا گیا لیکن اس کے نتیجے میں کس قدر نظریاتی اور اعتقادی غلطیاں وجود میں آئیں؟ اس سے غفلت برتنا اس شخص کے لئے ممکن نہیں ہے جس کو دین کا درد اور اس کی درست فہم اور خدمت کی توفیق وسعادت نصیب ہو جائے۔

## دوسری کوتاہی: فضائل کا ادھورا بیان

کسی عمل پر مرتب ہونیوالے فضائل تبھی حاصل ہوں گے جبکہ وہ عمل اللہ تعالیٰ کے دربارِ عالیہ میں شرف قبولیت سے سرفراز ہو جائے اور کسی عمل کی قبولیت کے لئے ضروری ہے کہ وہ شرعی احکام کے مطابق بھی ہو اور کرنے کا باعث ونیت بھی خالص ہو، ان دو باتوں کے بغیر قبولیت کا ضابطہ نہیں ہے اور یہ دونوں باتیں نصیب ہوں تو بھی قبولیت یقینی نہیں ہے بلکہ کریم وقادر اور بے نیاز رب کی مرضی ہے، چاہے تو قبول فرمائیں اور چاہے تو قبول نہ ہو، نہ کوئی اس سے پوچھنے والا ہے اور نہ کسی کا اس پر کوئی ایسا حقِ لازم ہے جس کی مخالفت کرنا خلافِ عدل وانصاف ہو۔

یہ بات اگر اس طرح پوری بتائی جائے تو اس سے کوئی قابلِ ذکر غلط فہمی پیدا نہیں ہوتی بلکہ اعمال کے متعلق وہ صحیح ومتوازن تصور پیدا ہوتا ہے جو شریعت کو مطلوب ہے کہ انسان نہ مکمل طور پر مایوسی کا شکار ہو اور نہ ہی اپنے اعمال وکردار پر غرور وشیخی کا مرتکب ہو جائے بلکہ ایک طرف وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کاملہ سے پر امید رہے اور ساتھ اس کے شان غناء وقہر کو دیکھ کر ڈرتا بھی رہے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ہاں فضائل بیان کرتے وقت شاذ ونادر ہی اس کا اہتمام ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ محض ایک پہلو کو دیکھ کر عام امت کے افراد میں جرأت پیدا ہوتی ہے اور خوف وخطر والا پہلو کم از کم ان خاص اعمال کی حد تک بالکل کمزور یا ختم ہو جاتا ہے جس سے متعدد مفاسد پیدا ہو جاتے ہیں۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر عمل کی فضیلت بیان کرتے وقت یہ پوری تقریر بھی کروائی جائے اور بیان وخطاب کو خواہ مخواہ ''تمنا مختصر سی ہے مگر تمہید طولانی'' کا مصداق بنا دیا جائے، لیکن موقع بموقع اس کا بیان

واظہار تو ضروری ہے تاکہ دینی تربیت حاصل ہو اور عمل میں جرأت و بے باکی پیدا نہ ہو کہ یہ رویہ گمراہی اور بے راہ روی کا بہت بڑا ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔

## تیسری کوتاہی: وعیدات کا بیان نہ کرنا

فضائل ومناقب کے اُدھورے بیان کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ چند نیک اعمال کے فضائل وفوائد بتائے جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ منکرات ومعاصی کے نقصانات وخطرات کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ اس کا ایک مزید نقصان یہ سامنے آتا ہے کہ بسا اوقات بعض اعمال وامور کے حسی ودنیوی فوائد وبرکات بتائے جاتے ہیں اور مخاطب چونکہ تفاوت مراتب سے واقف نہیں ہوتا اور یہ بھی اس کے دائرہ علم میں نہیں ہوتا کہ ان موعودہ فوائد کا حتمی حصول متعلقہ عمل کی قبولیت پر موقوف ہے، اس لئے اس کے لئے قبولیت کی شرائط بھی ضروری ہیں اور ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے متضاد معاصی ومنکرات کا ارتکاب نہ ہو۔

اب مخاطب شخص ان اعمال کو پورے خلوص وجذبے کے ساتھ بار بار کرنے لگ جاتا ہے لیکن جب دیکھ لیتا ہے کہ بار بار کرنے کے باوجود اس کو وہ فوائد حاصل نہیں ہوئے جو روایت میں اس نے دیکھے سنے تھے تو دل ہی دل میں کچھ تردد اور بے اطمینانی کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہی کیفیت وہ بنیادی بیج ہے جو ہزاروں افراد کے دل ودماغ میں کفر وارتداد کی صورت میں نمودار ہوا ہے اور انجام کار وہ دین وایمان کی نعمت سے محروم ہو گئے اور تردد وتذبذب کی وادیوں میں جا کر یوں پھنسے کہ واپس پلٹنے کا راستہ ہی نظر نہیں آیا۔

اس لئے نیک اعمال کے فضائل کے ساتھ ساتھ بد اعمال کے مفاسد ونقصانات بیان کرنا بھی ضروری ہے اور دیکھا جائے تو قرآن کریم میں جگہ جگہ یہی دستور معلوم ہوتا ہے کہ جہاں نیک اعمال کے فضائل بتائے گئے ہیں وہاں ساتھ بد اعمال کے مفاسد سے بھی انسانیت کو روشناس کرایا جاتا ہے، جہاں جنت کی نعمتوں کا ذکر کیا جاتا ہے وہاں ساتھ جہنم کی تلخیوں کا بھی تذکرہ ہوتا ہے، نیک افراد وشخصیات کے نیک واچھے انجام کے بتلانے کے ساتھ ساتھ بدکار لوگوں کے انجام بد پر بھی متنبہ کرنے کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

## چوتھی کوتاہی: نیک اعمال کو تقابلی انداز میں پیش کرنا

بسا اوقات یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ نماز، روزہ، درود شریف اور صدقہ وغیرہ اعمال صالحہ کے فضائل بیان کرتے وقت دیگر اعمال کے ساتھ تقابلی انداز میں ان کو پیش کیا جاتا ہے اور پھر ان اعمال کی فضیلت وبرتری ثابت کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر جو شخص اتنی بار درود شریف پڑھے، اس کو اتنے شہداء کا ثواب ملتا ہے یا فلاں فلاں مقدار میں حج کرنے کا ثواب ملتا ہے، اسی طرح فلاں کیفیت کے ساتھ نماز پڑھنے

سے جہاد وقتال کرنے کا ثواب ملے گا، وغیرہ وغیرہ۔

ان میں سے جو فضائل صحیح روایات سے ثابت ہے وہ تو سر آنکھوں پر مسلم ہے، لیکن عملی طور پر اول تو اس بات کی تحقیق ہی گوارا نہیں کی جاتی کہ جو فضیلت بتائی جارہی ہے کیا وہ محدثین کرام کے اُصول کے مطابق ثابت ہے یا نہیں؟ اور اس کو حدیث رسول کے طور پر بیان کرنا درست ہے یا نہیں؟ دوسری بڑی کوتاہی اس میں یہی ہے کہ اگر کسی مختصر اور آسان عمل کی کوئی بڑی فضیلت ثابت ہے بھی، تو اس کو دیگر اعمال کے ساتھ مقابلے کے انداز میں بیان کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ اس سے دیگر اعمال کی اہمیت گھٹنے لگتی ہے اور بعض اوقات جذباتی طبیعت کے لوگ اسی بحث وکھوج میں ایک ایسے موڑ پر بھی جا کر پہنچتے ہیں کہ وہ دیگر دینی اعمال کی بنسبت دل ودماغ میں ایک خاص قسم کا تاثر محسوس کرنے لگتے ہیں جس میں ان اعمال کو اپنی واقعی شرعی اہمیت دینے تک کو تیار نہیں ہوتے۔

خدانخواستہ اگر نوبت یہاں تک پہنچ جائے تو آگے اللہ ہی سلامت رکھے، وہ منزل دُور نہیں ہے جہاں ایسا بیمار دل لاشعوری طور پر دین واسلام کو ہی سلام کرجائے، یا ایسے شرعی اعمال وافعال سے توحش اور نفرت کی نحوست اس کو شعوری طور پر کفر کی کسی وادی میں لے پہنچائے، ایسا کچھ بعید نہیں ہے کیونکہ یہ دین اپنی تمام تر تعلیمات وہدایات سمیت اللہ تعالیٰ کو بہت ہی محبوب ومطلوب ہے، اس کے ساتھ نفرت وتوحش پیش آنا نہایت بھیانک انجام کا موجب ہے۔

## دینی اعمال کو تقابلی انداز میں لینے کے نقصانات

دینی اعمال، شعبوں اور ان کے فضائل ومناقب کو تقابلی انداز میں پیش کرنے کے بہت سے مفاسد میں سے ایک بڑا مفسدہ یہ بھی ہے کہ اس سے دین میں غلو کی بیماری پیدا ہوجاتی ہے اور یہی وہ بیماری ہے جس سے قرآن وحدیث میں بار بار روکا گیا ہے، اہل کتاب اور ان کے دین میں غلو کی مثالیں دے دی کر سمجھایا گیا ہے کہ یہ ان مہلک امراض میں سے ایک اہم اور اساسی مرض ہے جس سے دین اور اہل دین کے اعتقادات ونظریات میں کھوکھلا پن شروع ہوجاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان سے ایمانی واحسانی صفات واخلاق رخصت ہوجاتے ہیں جس کے بعد امت جسم بے جان کی تصویر بن جاتی ہے۔

نیز اسی کا مضر نتیجہ ہے کہ لاشعوری طور پر دین دار افراد خود اپنے ہی دین پر حملہ آور بن جاتے ہیں چنانچہ جس عمل/شعبے کے خلاف وہ کسی دوسرے عمل یا شعبے کی خودساختہ برتری ثابت کرنا چاہتے ہیں اور اس مزعومہ دعویٰ کے لئے خودساختہ قسم کے دلائل وبراہین کا سلسلہ شروع کرتے ہیں، وہ عمل خود اسی دین کا حصہ

ہوتا ہے جس کے وہ مدح خواہ ہیں، ان کی اس نشتر بازی سے جو عمل چھلنی ہوتا ہے وہ اسی دین کا بتلایا اور سکھایا ہوا عمل ہوتا ہے جس کے وہ پیروکار ہوتے ہیں۔

یہیں سے خواہی نخواہی یہ سوالیہ نشان خود بخود جی بھر کر اُٹھنے لگتا ہے کہ اگر کوئی دین ومذہب جزوی طور پر نامعقول، بے بنیاد یا نامناسب رہنمائی کرسکتا ہے تو اس پر یہ اطمینان کیونکر کیا جاسکتا ہے کہ کلی طور پر اس کی رہنمائی بالکل درست، معقول اور مناسب ہے؟ اور اگر میری عقل وفکر اس قابل ہے کہ وہ مذہب کی جزوی غلطی یا نامناسب رہنمائی دریافت کرسکتی ہے اور اس کو دلائل کا جامہ بھی پہنا سکتی ہے جس پر میں مطمئن ہوجاتا ہوں تو مجھ جیسے دیگر اولادِ آدم کے دل ودماغ پر آخر کس نے تالے لگائے ہے جو دیگر مسائل واحکام میں دین کی غلط رہنمائی کا مؤاخذہ نہ کرسکے؟ اور ایسی صورتِ حال میں خود دین پر آنکھیں بند کرکے اعتماد کرنے کی ضرورت بلکہ جواز کیا ہے؟

غرض مختلف اعمال وافعال کے فضائل کو تقابلی انداز میں پیش کرنے کے بہت سے مفاسد ہیں جن میں سے کچھ کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے، اس لئے دین کی تعلیمات کو ہر ایسے اسلوب میں پیش کرنے سے حد درجہ اجتناب کرنا ضروری ہے جس کے نتیجے میں اس نوعیت کے دینی مفاسد پیدا ہوتے ہوں۔ پورے دین پر اپنی استطاعت کے مطابق عمل کرنا اور اپنی قدرت کے موافق اس کے تمام شعبوں اور احکام کو خدا کی زمین پر نافذ کرنے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔ صاف سیدھی بات یہ ہے کہ مردِ مومن صرف اس بات کا مکلّف نہیں ہے کہ بڑے فضائل اور اجر وثواب والے اعمال کرے اور زیادہ سے زیادہ نیکیاں سمیٹنے پر اکتفاء کرے بلکہ پورے دین متین کو اپنی اصل شکل وصورت میں برقرار رکھنا بھی اس کی اہم ذمہ داری ہے جس میں بے جا غفلت اور قصور جرم وزیادتی ہے اور اگر خدانخواستہ پوری ملت اس جرم میں شریک کار ہوجاتی ہے تو ایسی امت کو دین دار کہلانے کا حق ہے نہ ہی اہلِ زمین کی زمامِ قیادت سنبھالنے کا کوئی استحقاق ہوسکتا ہے بلکہ خود زمین پر ان کا رہنا ہی بوجھ بن جاتا ہے۔

## حضرات سلف صالحین کا مزاج ومعمول

حضرات سلف صالحین (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) اس دین متین کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویر ہے۔ بیان وتحریر سے ہٹ کر اگر کوئی شخص مجسم شکل میں دین سمجھنا چاہے تو سلف صالحین کی زندگی سے وہ اپنا گوہر مقصود بحسن وخوبی حاصل کرسکتا ہے۔ زیر بحث موضوع کے حوالے سے دیکھا جائے تو اُن کی زندگی اِس باب میں بھی راہ اعتدال پر مبنی تھی، چنانچہ ان کے ہاں یہ تفریط بھی نہ تھی کہ فضائل ومناقب کی روایات کی طرف کوئی

توجہ واہتمام نہ ہو بلکہ وہ اس کے بڑے قدر دان تھے لیکن اس افراط میں بھی وہ بالکل مبتلا نہ تھے کہ محض چند اعمال کے فضائل کو لے کر دین کے دیگر احکام وتعلیمات سے غفلت برتنے لگے، یا اس حد تک فضائل میں انہماک ہونے لگے کہ صحیح وضعیف کی تمیز نہ رہے یا اعتقادی وعملی طور پر ضروری اور غیر ضروری کا فرق عنقاء ہوجائے یا جذباتی اور تقابلی انداز میں مختلف دینی اعمال کو پیش کرنے لگیں۔ بے اعتدالی کی ان تمام صورتوں سے ان کا اعتقاد وبرتاؤ پاک تھا۔ ان حضرات کی زندگیوں میں ایک طرف تو مستحبات ومندوبات پر دوام ومواظبت کی عجیب وغریب مثالیں ملتی ہیں جو وادی استقامت میں انمٹ نقوش کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی، دوسری طرف بیان فضائل میں شریعت کے مقاصد کا حد درجہ اہتمام ان کے یہاں جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔

## حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خداداد بصیرت

صحیح مسلم وغیرہ کتبِ حدیث کی یہ روایت مشہور ہے کہ ایک بار حضرت رسول اکرم ﷺ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ جو شخص دل کے یقین کے ساتھ لا الہ الا اللہ کی گواہی دیدے، اس کو جنت کی خوشخبری سنائے اور ساتھ تصدیق وتائید کے لئے اپنے نعلین مبارک بھی عنایت فرمائے۔ حضرت ابو ہریرہ وہاں سے باہر نکلے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے پہل ملاقات ہوئی، آپ کے استفسار پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنا مقصد بتایا کہ اس طرح لوگوں کو جنت کی خوشخبری دینے جارہا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ نے سختی کے ساتھ منع فرمایا اور زور سے سینے کے قریب ہاتھ مارا جس کی وجہ سے حضرت ابو ہریرہ گر گئے اور جا کر حضور ﷺ کو پورا ماجرا سنایا۔ اتنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی دربار اقدس میں آپہنچے اور جب آپ کے استفسار پر حضور ﷺ نے حضرت ابو ہریرہ کی اس بات کی تصدیق وتائید فرمائی جو اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بتائی تھی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور نبی اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ: ”**فلا تفعل فإني أخشى أن يتكل الناس عليها فخلهم يعملون.** ترجمہ: حضور ایسا نہ کیجئے: کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ لوگ اسی پر اعتماد کرنے لگ جائیں گے، لہٰذا ان کو چھوڑ دیجئے کہ عمل کرتے رہیں۔“ حضور نبی اکرم ﷺ نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس بات سے اتفاق فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ: ”**فخلهم**.“ [مسلم، کتاب الایمان، ص:۶۰]

اس روایت میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جو فضیلت وبشارت لوگوں کو دینا چاہ رہے تھے، وہ یقیناً درست تھی اور خود حضور ﷺ کے زبان اقدس سے سنی تھی بلکہ خود حضور اقدس ﷺ نے ہی لوگوں کو سنانے کے لیے بھیجا تھا، لیکن اس کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے

پھیلانے سے منع کیا اور حضور ﷺ نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس بات سے اتفاق فرمایا۔ حضرت عمر کی ممانعت کی بنیادی وجہ وہی تھی جو اوپر روایت میں درج ہے کہ (گویہ فضیلت وبشارت برحق ہے لیکن) اس کو سن کر لوگوں میں عملی لحاظ سے سستی پیدا ہو جائے گی اور خطرہ ہے کہ امید ورجا کا پہلو حد سے زیادہ غالب آ کر بے عملی یا بدعملی کی شکل اختیار کریگا، اس لئے عمومی طور پر اس کی تبلیغ وتشہیر مناسب نہیں ہے۔

## بیانِ فضائل کے وقت داعی کی ذمہ داری

اس سے معلوم ہوا کہ محض کسی روایت/فضیلت کا صحیح سند سے ثابت ہو جانا بھی اس کا متقاضی نہیں ہے کہ ضرور اس کی عمومی تبلیغ کی جائے بلکہ داعی کیلئے اوّلاً اپنے گرد وپیش ماحول کا جائزہ لینا چاہئے اور دین کے نام وعنوان سے وہ جو کچھ لوگوں کو پہنچانا چاہتا ہے، اس کے ممکنہ نتائج واثرات کا موازنہ کر لینا چاہئے کہ اس کے نتیجے میں دینی مصالح زیادہ پیدا ہو سکتے ہیں یا دینی لحاظ سے مفاسد وخطرات ممکن ہیں؟ ٹھنڈے دل ودماغ سے ان باتوں کا جائزہ لینے کے بعد ہی آگے کوئی مناسب اقدام کرے۔

اللہ تعالیٰ ہم سمیت پوری امتِ مسلمہ کو دین کی صحیح فہم وفقاہت نصیب فرمائیں اور استقامت کے ساتھ اس کی خدمت کرتے رہنے کی توفیق سعید عطاء فرمائیں۔

عبید الرحمٰن، جامعہ محمدیہ، مایار مردان، ربیع الاول ۱۴۴۳ھ

## وفیات

شیخ المشائخ حضرت مولانا خواجہ خان محمد رحمہ اللہ فرزند صاحبزادہ رشید احمد رحمہ اللہ

مولانا مفتی رب نواز کے چچا سسر مستری عبد الخالق بھٹی رحمہ اللہ

مولانا مفتی شفقت رحمہ اللہ [سرگودھا]

مفسر قرآن مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتی رحمہ اللہ کے خادم خاص مستری منیر احمد رحمہ اللہ

جناب قاری گلزار احمد قاسمی رحمہ اللہ [گوجرانوالہ]......نوجوان عالم مولانا محمد عامر گھلو [بہاول پور]

محترم قاری محمد امین صاحب [مدرس: دار العلوم مدنیہ بہاول پور] کی بیٹی رحمہا اللہ

مولانا عبد الکریم دین پوری کی نواسی رحمہا اللہ

عنایت اللہ سومرو [جنھان سومرو] کا بیٹا رحمہ اللہ......جمن چانگ صاحب [حیدر آباد] کی والدہ رحمہا اللہ

مولانا جمیل الرحمٰن عباسی کے دو قریبی عزیز حافظ ابوبکر عباسی، حافظ شاہد عباسی رحمہما اللہ

محمد ارشاد عباسی رحمہ اللہ [نخلور بہاول پور]......حافظ محمد عقیل عباسی [ھتھیجی بہاول پور]

قارئین سے مرحومین کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کی درخواست ہے۔

مفتی محمد طارق محمود [مدرس و معین مفتی جامعہ عبداللہ بن عمر، لاہور]

# مدرسہ دیو بند کا فکری اور عملی منہج

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد جب برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا، اور حالات سے یقین ہو چلا کہ اسلام کا چمن اَب اُجڑا اور یہ کہ ہندوستان بھی اسپین کی تاریخ دہرانے کے لیے تیار ہو چکا ہے، تو مسلمانوں کے دین کے تحفظ کے لیے ۱۵/محرم ۱۲۸۳ھ/ ۳۰/مئی ۱۸۶۷ء کو دیو بند میں ایک دینی مدرسے کی بنیاد رکھی گئی۔ جسے آج دار العلوم دیو بند کے نام سے جانا جاتا ہے۔

[تاریخ دار العلوم دیو بند: ص۱۲، ۱۴ ملخصا، دار الاشاعت، کراچی، سنہ ندارد]

زیر نظر مقالے میں اسی درسگاہ کا بنیادی تعارف درج ذیل ۱۲/نکات میں ملاحظہ فرمائیں: ۱: دیو بندی دراصل تعلیمی ادارے کی طرف نسبت ہے۔ ۲: عقیدہ اور کلام میں معتدل طرزِ فکر۔ ۳: حدیث وفقہ میں متوازن طریقہ۔ ۴: تصوف اور تزکیہ کا اہتمام۔ ۵: دین کے دفاع کی طرف خصوصی توجہ۔ ۶: تدریس وافتاء۔ ۷: دعوت وارشاد۔ ۸: تصنیف وتالیف۔ ۹: سیاسیات میں شرکت۔ ۱۰: استغناء اور توکل۔ ۱۱: متفرق تعلیمی خصوصیات: ا: کتاب وار نظام تعلیم۔ ب: طریق درس۔ ج: امتحان۔ د: مادری زبان میں تعلیم۔ ھ: خالص دینی تعلیم۔ و: بقدر ضرورت معقولات کی تعلیم۔ ۱۲: خاتمہ مسک

### ۱: دیو بندی دراصل تعلیمی ادارے کی طرف نسبت ہے

علمائے دیو بند یا جماعت دیو بند کی یہ نسبت دیو بندیت یا قاسمیت کوئی وطنی یا قومی یا فرقہ واری نسبت نہیں، بلکہ صرف ایک تعلیمی نسبت ہے جو مقام تعلیم (دیو بند) یا مدار روایت شخصیت حضرت قاسم العلوم کی نسبت سے (دیو بندی یا قاسمی) معروف ہوگئی ہے، جس سے اس جماعت کا تعلیمی انتساب اور اس کی روایت و درایت کا استنا دواضح ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح سے جیسے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے فضلا علیگ کے لقب سے، یا جامعہ ملیہ دہلی کے فضلا جامعی کے نام سے، یا مظاہر علوم کے فضلا مظاہری کے نام سے۔ علمائے دیو بند اپنے دینی رخ اور مسلکی مزاج کے لحاظ سے کلیۃ اہل السنۃ والجماعۃ ہیں، نہ وہ کوئی نیا فرقہ ہے، نہ نئے عقائد کی کوئی جماعت ہے۔

(علمائے دیو بند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج: ص۲۲، ۲۳، ادارہ اسلامیات، لاہور، ط: اول، ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء)

### ۲: عقیدہ اور کلام میں متوازن طرز فکر

قال مولانا الشيخ خليل احمد السهارنفوری: إنا - بحمدالله و مشائخنا رضوان الله عليهم أجمعين و جميع طائفتنا و جماعتنا - مقلدون لقدوة الأنام و ذروة الإسلام الإمام الهمام الإمام

الأعظم أبی حنیفة النعمان رضی الله تعالی عنه فی الفروع، ومتبعون للإمام الهمام أبی الحسن الأشعری والإمام الهمام أبی منصور الماتریدی رضی الله عنهما فی الاعتقاد والأصول، ومنتسبون من طرق الصوفية إلى الطريقة العلية المنسوبة إلى السادة النقشبندية، والطريقة الزكية المنسوبة إلى السادة الجشتية، وإلى الطريقة البهية المنسوبة إلى السادة القادرية، وإلى الطريقة المرضية المنسوبة إلى السادة السهروردية رضی الله عنهم أجمعين.

(المهند(المترجم) :ص۲۹،۳۰،ادارہ اسلامیات،لاہور ط:۱۴۰٤/۱۹۸٤)

**حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ہم اور ہمارے مشائخ اور ہماری ساری جماعت بحمداللہ فروعات میں مقلد ہیں مقتدائے خلق حضرت امام ہمام امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے ،اوراصول واعتقادات میں پیرو ہیں امام ابوالحسن اشعری اور امام ابومنصور ماتریدی رضی اللہ عنہما کے ۔اور طریقہائے صوفیہ میں ہمیں انتساب حاصل ہے سلسلہ عالیہ حضرات نقشبندیہ،اورطریقہ زکیہ مشائخ چشت اورسلسلہ بہیہ حضرات قادریہ اورطریقہ مرضیہ مشائخ سہروردیہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ۔**

قال الامام الشيخ أنورشاه الكشميري رحمه الله تعالى: أثبت شیء فی هذا الباب (أی فی معتقد الأئمة الحنفية) عقيدة الطحاوی، وأحسن شروحه شرح القونوی.

(فيض الباری مع البدر الساری :۱/۱۳٤،دار الكتب العلمية ،بيروت،ط:۱٤۲٦)

**حضرت مولانا انورشاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ائمہ حنفیہ کے عقیدے کے بارے میں سب سے زیادہ قابل اعتماد دستاویز عقیدہ طحاویہ ہے۔اوراس کی سب سے عمدہ شرح قونوی کی ہے۔**

**حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: دیوبندیت کوئی مستقل مذہب نہیں۔سلف اور جمہور اہل سنت والجماعت کے مکمل اتباع ہی کا نام دیوبندیت ہے۔جو عقیدہ جمہور اہل سنت والجماعت کے خلاف ہے،وہ دیوبندیت کے بھی خلاف ہے۔**(حیات انبیائے کرام:ص۶۰،**المکتبة الاشرفیه**،جامعہ اشرفیہ،لاہور،ط:سن ندارد)

**اورفرماتے ہیں:''بے کم وکاست ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کتب عقائد اہل السنّت والجماعت کو دیکھ لیجیے،جو عقائد ان تمام کتابوں میں صراحت کے ساتھ مذکور ہیں علمائے دیوبند انھیں عقائد کے زبردست حامل اوران کے خلاف کرنے والوں کی تردید میں پیش پیش ہیں''۔**(المہند (مترجم):ص۱۷۵)

**حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حضرات متکلمین نے حق تعالیٰ کی ذات وصفات کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ درحقیقت اہل بدعت والحاد کی مدافعت ہے۔اس کو علمی اصطلاح میں صرف منع (احتمال ظاہر کرنے) کے درجے میں رہنا چاہیے،جس کا حاصل یہ ہے کہ ایسی صورت ہو تو یہ ممکن اور محتمل ہے،محال نہیں۔یہ نہیں کہ واقع میں عنداللہ ایسا ہی ہے،مگر ہو یہ گیا کہ متاخرین متکلمین بجائے مانع بننے کے مدعی بن بیٹھے،اوراپنے پیدا کیے**

ہوئے احتمالات کو اسلام کے عقیدہ کا درجہ دے دیا۔ اس لیے میں تو یہ کہتا ہوں کہ علم کلام کو صرف مدافعت اہل بدعت اور منع اصطلاحی یعنی احتمال وامکان کے درجے میں رکھنا چاہیے، اور عقائد کو مثل سلف صالحین کے ان مباحث سے سادہ رکھنا چاہیے۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۲۴/۱۵۹، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ط: ۱۴۲۲ھ، اور دیکھیے: ملفوظات حکیم الامت: ۲۶/۷۲، اور ۲۶/۲۳۲)

اور فرماتے ہیں: ایک غیر مقلد صاحب کی عنایت سے ایک رسالہ اور لکھنا پڑا ''**تمهيد الفرش فى تحديد العرش**'' جس میں استواء علی العرش کی بحث ہے، گو صفات کے باب میں کلام کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے، اس سے ہمیشہ میں خود بھی منع کرتا ہوں اور اپنے بزرگوں کو بھی اس سے بچتے دیکھا ہے۔ باقی متقدمین نے جو اس میں کچھ کلام کیا ہے وہ منع کے درجہ میں تھا، متاخرین نے دعوی کے درجہ میں کر لیا اور اب تو اس میں بہت ہی غلو ہو گیا، بلاضرورت کلام کرنے کو میں خود بدعت سمجھتا ہوں، مگر بضرورت کلام کرنا پڑتا ہے، سلف کا یہی عمل تھا۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۶/۱۰۱، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ط: ۱۴۲۹ھ) رسالہ **تمهيد الفرش فى تحديد العرش**، آیات صفات کے غامض مبحث میں انتہائی شاندار تحقیق ہے۔ (دیکھیے: امداد الفتاوی: ۶/۲۶ - ۶۲، مکتبہ دار العلوم کراچی، ط: ۱۴۳۱ھ)

اور فرمایا: متکلمین نے مسائل کلامیہ میں جتنے دعوے کیے ہیں ان میں سے بعض پر جزم نہیں کرنا چاہیے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ رویت بے کیف ہوگی، بے جہت ہوگی۔ صحابہ کا تو مذہب اس میں یہ تھا کہ کیا خبر کیسی ہوگی؟ واللہ اعلم۔ ان تفصیلات کی وجہ سے بعض متقدمین ان متکلمین کے پیچھے نماز پڑھنے کو مکروہ کہتے ہیں جیسے بدعتی کے پیچھے۔ مگر میری سمجھ میں الحمدللہ اس کا فیصلہ آ گیا۔ وہ یہ کہ اگر ان تفصیلات کو باطل فرقوں کے دعووں کے مقابلے میں منع کے درجے میں رکھا جائے، دعوی نہ کیا جائے، گو بصورت دعوی کے ہوں، مگر مقصود دعوی نہ ہو، تو بدعت نہیں۔ اور دعوی واقعی خطرناک ہے۔ میں تو اسی توجیہ کی بناپر متکلمین کا بے حد معتقد ہوں، انھوں نے حق کی بڑی نصرت کی ہے، اور یہ نصرت بڑی عبادت ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۳/۲۳۴، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ط: ۱۴۲۳ھ)

اور فرمایا: فرق باطلہ اور اہل بدعت کی وجہ سے اہل حق کو کلام کرنا پڑا، ورنہ اہل حق فی نفسہ اس قسم کے کلام کرنے کو پسند نہیں کرتے، اس لیے کہ سلف سے منقول نہیں۔ اور میں بھی پسند نہیں کرتا، مجھ کو ہمیشہ اس قسم کے قیل و قال سے نفرت ہے، مگر بیچارے اہل حق کو اہل باطل کی گڑبڑ کی وجہ سے بولنا پڑا اور یہ ان کا بولنا ضرورت کی وجہ سے تھا۔ یعنی اول اہل بدعت نے دین میں شبہات نکالے، اہل حق نے ان کو دلیل کے ساتھ دفع کیا، جس سے صورت مناظرہ کی پیدا ہوگئی اور علم کلام مدون ہو گیا۔ پس ایسے مسائل میں اہل حق مدعی نہیں، بلکہ اہل بدعت مدعی ہیں۔ اور اہل حق انکے مقابلہ میں مانع ہیں۔ پھر اضطرار کے ساتھ ہی یہ بھی تھا کہ اس کلام اور مناظرہ کے کچھ حدود اور شرائط بھی

تھے، مگر بعض متأخرین نے اس کو بڑھالیا اس حد تک رکھا نہیں۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۴/۳۰۹)

حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اس قسم کی آیات (آیاتِ صفات) میں ہمارا مذہب یہ ہے کہ ان پر ایمان لاتے ہیں، اور کیفیت سے بحث نہیں کرتے۔ اور ہم یقیناً جانتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ مخلوق کے اوصاف سے منزہ اور نقص وحدوث کی علامات سے مبرا ہے، جیسا کہ ہمارے متقدمین کی رائے ہے۔ اور ہمارے متأخرین اماموں نے ان آیات میں جو صحیح اور لغت وشرع کے اعتبار سے جائز تأویلیں فرمائی ہیں تاکہ کم فہم سمجھ لیں، مثلاً یہ کہ ممکن ہے کہ استوا سے مراد غلبہ ہو، اور ہاتھ سے مراد قدرت۔ تو یہ بھی ہمارے نزدیک حق ہے۔ البتہ جہت ومکان کا اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کرنا ہم جائز نہیں سمجھتے۔ اور یوں کہتے ہیں کہ وہ جہت ومکانیت اور جملہ علامات حدوث سے منزہ وعالی ہے۔ (المہند مترجم: ص ۴۸)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اس تحقیق سے معلوم ہوگیا کہ دونوں طریق (سلف اور خلف کے آیاتِ صفات میں) علمائے اہل سنت اور اہل حق کے ہیں۔ ان میں سے کسی کی تجہیل یا تضلیل جائز نہیں، گو ترجیح فی نفسہ مسلک سلف کو ہے، اور عارض کے سبب مسلک خلف پر بھی عمل کیا جاسکتا ہے۔ (امداد الفتاوی: ۶/۳۴)

اس مقام پر مناسب ہے کہ علم کلام کی تدوین کی ضرورت پر تاریخی پس منظر میں ایک نگاہ ڈالی جائے، تاکہ علم کلام کا صحیح درجہ اور معتدل حیثیت، جو اوپر حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ملفوظات میں مذکور ہے، اس کی مزید وضاحت ہوجائے۔

علم کلام کی تدوین کا تاریخی پس منظر اور ضرورت:

معتصم اور واثق کے انتقال پر (جو مذہب اعتزال اور معتزلہ کے سرپرست تھے) معتزلہ کا زور ٹوٹ گیا۔ واثق کا جانشین خلیفہ متوکل مذہب اعتزال سے بیزار اور معتزلہ کا دشمن تھا۔ اس نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر معتزلہ کی عظمت واقتدار کے نشانات مٹائے اور ان کو حکومت سے بالکل بے دخل کر دیا، لیکن علمی حلقوں میں ابھی معتزلہ کا اثر باقی تھا۔ خلق قرآن کا عقیدہ تو اپنی طاقت کھو چکا تھا، لیکن ان کے دوسرے مباحث اور مسائل ابھی تازہ اور زندہ تھے۔ معتزلہ نے اپنی ذہانت، علمی قابلیت اور اپنی بعض نمایاں شخصیتوں کی وجہ سے اپنا علمی وقار قائم کر لیا تھا۔ اور قضا وافتا اور حکومت کے اندر بعض اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ تیسری صدی کے وسط میں ان کا خاصا دور دورہ ہوگیا۔ عام طور پر یہ تسلیم کیا جانے لگا کہ معتزلہ دقیق النظر، وسیع الفکر اور محقق ہوتے ہیں۔ اور ان کی آراء وتحقیقات عقل سے زیادہ قریب ہوتی ہیں۔ بہت سے نوجوان طالب علم اور شہرت پسند اعتزال کو فیشن کے طور پر اختیار کرتے۔

امام احمد کے بعد حنابلہ میں کوئی طاقتور علمی اور دینی شخصیت نہیں پیدا ہوئی۔ محدثین اور ان کے ہم مسلک علماء نے علوم عقلیہ اور نئے طریقہ بحث ونظر کی طرف (جس کا معتزلہ اور فلاسفہ کے اثر سے رواج پڑ چلا تھا)، توجہ

نہیں کی۔ نتیجہ یہ تھا کہ مباحثہ کی مجلسوں اور درس کے حلقوں میں محدثین کی یہ علمی کمزوری اور فلسفہ کے مبادی سے بے خبری محسوس کی جاتی تھی۔ اس کے مقابلہ میں علمی مباحثوں میں معتزلہ کا پلڑا بھاری رہتا۔ اور جو لوگ دین کا گہرا علم نہیں رکھتے تھے اور اس حقیقت سے واقف نہیں تھے کہ سطحی ذہانت معتزلہ کی تائید کرتی ہے، اور پختہ اور گہری ذہانت بالآخر محدثین ہی کے مسلک اور محکمات شریعت کو قبول کرتی ہے، وہ معتزلہ کی حسن تقریر، حاضر جوابی اور علمی موشگافی سے متاثر ہوتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ظاہر شریعت اور مسلک سلف کی علمی بے توقیری اور اسکی طرف سے بے اعتمادی پیدا ہو رہی تھی۔ خود محدثین اور ان کے تلامذہ کے گروہ کے بہت سے لوگ احساس کہتری کا شکار تھے، اور معتزلہ کی عقلیت اور تفلسف سے مرعوب ہو رہے تھے۔ یہ صورت حال دینی وقار اور سنت کے اقتدار کے لیے سخت خطرناک تھی۔ قرآن مجید کی تفسیر اور عقائد اسلام ان فلسفی نما مناظرین کے لیے بازیچہ اطفال بنے جا رہے تھے۔ مسلمانوں میں ایک خام عقلیت اور سطحی فلسفیت مقبول ہو رہی تھی۔ یہ محض ایک ذہنی ورزش تھی۔ اور اصطلاحات کی معرکہ آرائی۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے اور اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لیے نہ تو محدثین وحنابلہ کی دینی غیرت اور جوش کافی تھا۔ نہ عابدوں وزاہدوں کا زہد وعبادت، اور نہ فقہاء کے فتاوی اور جزئیات ومسائل پر ان کا عبور واستحضار۔

اس کے لیے ایک ایسی شخصیت درکار تھی جس کی دماغی صلاحیتیں معتزلہ سے کہیں بلند ہوں۔ جو عقلیت کے کوچے سے نہ صرف واقف بلکہ عرصہ تک اس کا رہ نوردرہ چکا ہو۔ جس کی بلند شخصیت اور مجتہدانہ دماغ کے سامنے اس زمانہ کی عقلیت اور فلسفہ کے علمبردار مبتدی طالب علم معلوم ہوتے ہوں۔ اور ایسے پست وحقیر نظر آتے ہوں جیسے کسی دیو قامت انسان کے سامنے پستہ قد انسان اور نوعمر بچے۔ اسلام کو فوری طور پر ایک ایسے امام اہل سنت کی ضرورت تھی۔ اور شیخ ابوالحسن اشعری کی ذات میں اس کو وہ شخصیت مل گئی۔

(تاریخ دعوت وعزیمت: ۱/۱۰۳، ۱۰۴، مجلس نشریات اسلام، کراچی، سن ندارد)

امام ابوالحسن اشعری نے معتزلہ اور محدثین کے درمیان ایک معتدل اور متوسط مسلک اختیار کیا۔ وہ نہ تو معتزلہ کی طرح عقل کی غیر محدود طاقت اور فرمانروائی کے قائل تھے کہ وہ الٰہیات کے بارے میں اور مابعد الطبعیات میں بھی بے تکلف عمل کر سکے اور اس کے جزئیات وتفصیلات اور ذات وصفات باری تعالی کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر کر سکے اور اس کو معیار قرار دیا جا سکے۔ نہ وہ بعض پرجوش محدثین وغالی حنابلہ کی طرح دین کی نصرت اور عقائد اسلامیہ کی حفاظت کے لیے عقل کا انکار اور اسکی تحقیر ضروری سمجھتے تھے۔ اور ان کلامی واعتقادی مباحث جو زمانہ کے اثرات سے شروع ہو گئے تھے احتیاط وسکوت واجب سمجھتے تھے۔ وہ معتزلہ اور فلسفہ زدہ علماء سے ان کی اصطلاحات اور علمی زبان میں گفتگو کرتے تھے، جس سے مذہب وعقائد اہل سنت کا وقار اور وزن بڑھتا تھا۔ (مصدر سابق: ۱/۱۰۸)

ان (امام ابوالحسن اشعری) کا اصلی کارنامہ اس مسلک سنت اور عقیدہ سلف کے ساتھ موافقت اور اس کی اجمالی تائید نہیں۔ یہ تو محدثین اور عام حنابلہ کر ہی رہے تھے۔ ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کتاب وسنت کے ان حقائق اور اہل سنت کے ان عقائد کو عقلی دلائل سے ثابت کیا۔ اور معتزلہ اور دوسرے فرقوں سے ان کے ایک ایک مسئلہ اور ایک ایک عقیدہ میں انہی کی زبان اور اصطلاحات میں بحث کر کے عقائد اہل سنت کی صداقت اور ان کا منقول ومعقول کے مطابق ہونا واضح کیا۔ دین کی (اس) اہم خدمت کی تکمیل اور وقت کے اس عظیم الشان فریضہ کے ادا کرنے میں وہ معتزلہ اور منحرف فرقوں کے معتوب بنے اور ایسا ہونا بالکل قدرتی تھا، لیکن وہ ان متشدد محدثین اور جامد حنابلہ کے اعتراضات کا ہدف بھی بن گئے جن کے نزدیک ان مباحث میں حصہ لینا اور فلسفہ کی اصطلاحات کا استعمال کرنا اور نقلی مباحث ومسائل میں عقلی استدلال سے کام لینا ہی ایک زیغ وضلال کی بات تھی۔

(مصدر سابق: ۱/۱۱۰، ۱۱۱)

ان (امام ابوالحسن اشعری) کے نزدیک عقائد کا ماخذ یقیناً وحی ونبوت محمدی ہے اور اس کا ذریعہ علم کتاب وسنت اور صحابہ کرام کے اقوال وروایات ہیں۔ اس بارے میں ان کا راستہ معتزلہ وفلاسفہ سے بالکل جدا اور اس کے متوازی ہے، لیکن وہ ان حقائق وعقائد کے ثبوت میں تائید کے لیے عقلی استدلال اور رائج الوقت الفاظ واصطلاحات سے کام لینا نہ صرف جائز بلکہ وقت کے تقاضے کی بناء پر ضروری اور افضل الجہاد سمجھتے ہیں۔ نیز وہ مباحث جن کا تعلق عقلیات وحسیات سے ہے اور معتزلہ وفلاسفہ نے ان کو (خوامخواہ) عقائد کی بحث کا جزو بنا دیا ہے اور اپنی ذہانت اور زبان آوری سے ان کو حق وباطل کا معیار قرار دے دیا ہے امام ابوالحسن اشعری کے نزدیک ان سے گریز کرنا درست نہیں۔ شریعت کے وکیل اور ترجمان کو ان دائروں میں بھی ان کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔ (مصدر سابق: ۱/۱۱۱)

محافظین شریعت اور متکلمین اہل سنت کا فرض ہے کہ عقائد والٰہیات کے دائرہ میں جو نئے سوالات پیدا ہو رہے ہیں یا نئے اعتراضات کئے جا رہے ہیں ان کا جواب دیں اور زمانہ کی عقلیت کے مطابق عقائد حقہ کو ثابت ومدلل کریں۔ امام ابوالحسن اشعری نے اسی مدعا کو ثابت کرنے کے لیے ایک مستقل رسالہ **استحسان الخوض فی علم الکلام** تصنیف کیا۔ (مصدر سابق: ۱/۱۱۲)

معتزلہ سے ہر وقت برسر مقابلہ ہونے کی وجہ سے امام ابوالحسن (اشعری) کے علم کلام میں بعض انتہا پسندانہ باتیں آ گئی تھیں۔ اور بعد کے اشاعرہ نے معاملہ کو اور آگے بڑھا دیا۔ امام ابو منصور (ماتریدی) نے حشو وزوائد اور ایسے التزامات کو جو معتزلہ کی ضد میں اشعری علم کلام کا جز بن گئے تھے، اور ان کا ثابت کرنا اور نباہنا مشکل تھا خارج کر دیا اور اہل سنت کے علم کلام کی مزید تنقیح وتہذیب کی اور اس کو زیادہ معتدل اور جامع بنا دیا۔ امام ابو منصور اور ان کے متبعین کا یہ اختلاف جزئی اور محدود تھا۔ ایسے مسائل جن میں ماتریدیین نے اشاعرہ سے اختلاف کیا ہے تیس چالیس

سے زیادہ نہیں، اوران میں بھی اختلاف بیشتر لفظی ہے۔(مصدر سابق: ۱/۱۱۵)

چھٹی ساتویں صدی میں اشعریت وحنبلیت کے اختلاف نے باوجود بنیادی اتحاد کے تقریباوہ شکل اختیار کرلی تھی جو چوتھی صدی میں اعتزال وسنیت کے اختلاف کی تھی۔اشاعرہ صفات کی تشریح اور تاویل کرتے تھے۔ اورحنابلہ اس کو بالکل اپنی حقیقت اور لفظ پر رکھتے تھے۔ہر گروہ خوش نیتی کے ساتھ اس کو دینی خدمت اور سنت وشریعت کے ساتھ خیر خواہی سمجھتا تھا۔لیکن بعد کی صدیوں میں اس کو غیر معمولی اہمیت اور طول دے دیا گیا۔اور رائی کا پہاڑ بن گیا۔تحزب وتعصب نے اس کو بھی کفر وایمان کا معیار قرار دے دیا۔(مصدر سابق: ۲/۲۸۹، حاشیہ ۱)

**اسلامی عقائد کے دفاع میں حضرت نانوتوی قدس سرہ کی امتیازی شان:**

مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: نصوص صریحہ سے ثابت شدہ عقائد تقریباً سب کے یہاں متفق علیہ ہیں۔اس لیے ان میں علاوہ نص کتاب وسنت کے اجماع بھی شامل ہے،لیکن استنباطی یا فروعی عقائد یا قطعی عقیدوں کی کیفیات وتشریحات میں ارباب فن کے اختلافات بھی ہیں۔اس لیے ان میں یکسوئی حاصل کرنے کے لیے متکلمین کے بابصیرت ائمہ میں سے کسی کا دامن سنبھالنا اسی طرح ضروری تھا جس طرح فقہیات اور اجتہادی اختلافات میں ایک فقہ معین کی پابندی ضروری تھی۔اس سلسلہ میں اول تو علمائے کلام کے بارہ میں علمائے دیوبند کا عمومی ذوق ومشرب یہ ہے کہ وہ متکلمین کے اختلافات میں پڑ کر کسی طبقہ کی جانب داری نہیں کرتے، بلکہ تمام متکلمین کی عظمت قائم رکھ کر حتی الامکان انھیں جوڑنے ہی کی فکر میں رہتے ہیں۔ثانیاً اس بارہ میں بھی فقہ معین کی طرح کلام معین سے وابستہ رہتے ہوئے بھی تحقیق کا سرا اُنھوں نے ہاتھ سے نہیں دیا۔کلامی مسائل میں خصوصیت کے ساتھ علمائے دیوبند میں قاسمیت کا رنگ غالب ہے، جو حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ بانی دارالعلوم دیوبند کی حکیمانہ تعلیمات سے ماخوذ ہے۔ان مسائل کے اثبات میں حضرت کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے اشاعرہ اور ماتریدیہ کے اختلافات میں ردوقدح کی راہ اختیار نہیں فرمائی، بلکہ اہم اور بنیادی مسائل میں رفع اختلاف اور تطبیق وتوفیق کا راستہ اختیار فرمایا، جس سے کلامی مسائل کا بڑے سے بڑا اختلاف نزاع لفظی محسوس ہونے لگتا ہے۔(علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج: ص ۱۵۱، ۱۵۲)

قاسم ثانی مولانا شبیر احمد عثمانی حضرت نانوتوی قدس سرہ کے بارے میں لکھتے ہیں: اور یہی وہ فاضل ہے جس نے علم کلام کی ایک ایسے انوکھے طرز میں بناڈالی جوان شاء اللہ قیامت تک کے واسطے پتھر کی لکیر ہے۔اور جس پر ہمارا ناز کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔اس فاضل نے جس کو عام طور پر مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، اپنی مختلف کتابوں میں جو مفید بیانات درج کیے ہیں وہ اس مسئلہ عقل ونقل میں ہماری بہت زیادہ مشکل کشائی کرتے ہیں۔(کمالات عثمانی: ص ۳۹۶، مولانا محمد انوار الحسن انور قاسمی، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ط: ۱۴۲۷ھ)

علمائے دیوبند اشعری ہیں یا ماتریدی؟

اس مرحلہ پر پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ کلامی مسائل میں جبکہ مسلمہ امام دو ہی ہیں، ایک امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ تعالیٰ اور ایک امام ابومنصور ماتریدی رحمہ اللہ تعالیٰ تو علمائے دیوبند اشعری ہیں یا ماتریدی؟ اس بارہ میں خود علمائے دیوبند ہی کے عرف میں تو وہ ماتریدی ہی کی نسبت سے معروف ہیں، لیکن انھی میں سے ایک جماعت ان کے اشعری ہونے کی رائے بھی رکھتی ہے۔ اولا اس لیے کہ انکے علمی مورث اعلی حضرت الامام شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں، انکے کلام سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ اشعری ہیں، اس لیے علمائے دیوبند کو بھی وہ اشعری سمجھتے ہیں۔ دوسرے اس لیے کہ اکابر دیوبند اپنے درسوں، تقریروں اور قلمی تحریروں میں مسائل اشعریت کا پاس ولحاظ رکھتے ہیں۔ لیکن لقب کے لحاظ سے ان دونوں قولوں کو سامنے رکھ کر جو وجوہ قبول سے خالی نہیں ہیں، انکے ماتریدیت اور اشعریت کے ملے جلے رخ کو سامنے رکھ کر، اگر انھیں اشعریت پسند ماتریدی کہا جائے تو ان کے کلامی مزاج کے حسب حال ہوگا، جبکہ وہ جامع بین الاشعریت والماتریدیت ہی نظر آتے ہیں۔ بلکہ ان کے جامعیت آفریں مباحث کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اشعریت اور ماتریدیت کے اختلافات آخر کار نزاع لفظی ثابت ہوتے ہیں۔

(علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج: ص ۱۵۶، ۱۵۷)

مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تیسری بات جو بہت تجربہ کی ہے، وہ یہ کہ میں نے بھی کتابیں پڑھی ہیں، اسلام کے مذاہب اربعہ اور ان سے باہر نکل کر تقابلی مطالعہ کیا ہے، شاید کم ہی لوگوں نے اس طرح کا مطالعہ کیا ہوگا، ان تمام کے مطالعے کے نچوڑ میں ایک گُر کی بات بتاتا ہوں کہ جمہور اہلِ سنت کے مسلک سے کبھی نہ ہٹیے گا۔ اس کو لکھ لیجیے، چاہے آپ کا دماغ کچھ بھی بتائے، آپ کی ذہنیت آپ کو کہیں بھی لے جائے، کیسی ہی قوی دلیل پائیں جمہور کے مسلک سے نہ ہٹیے، اللہ تعالیٰ کی جو تائید اس کے ساتھ رہی ہے جس کے شواہد وقرائن ساری تاریخ میں موجود ہیں۔ (خطبات علی میاں: ۱/ ۳۴۸، ت: مولانا محمد رمضان میاں، دارالاشاعت کراچی، ط: ۲۰۰۲م)

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں جرأت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب بھی دنیا میں امام ابوالحسن اشعری اور ابوالمنصور ماتریدی کے ایسے وکیل موجود ہیں جو اسلامی معتقدات کے متعلق ان تمام شبہات کا استیصال کرتے ہوئے جو کسی نئے پیرایہ میں ظاہر کیے جائیں قدیم علم کلام کے کامل اور مکمل ہونے کا ثبوت دے سکیں۔ یہ عبارت علامہ عثمانی کی اس کلامی طاقت کا بے پناہ ظہور ہے۔ جو ان کے اندر قدرت نے ودیعت کر رکھی تھی۔ اس عبارت میں غائبانہ انداز میں اپنے آپ کو امام ابوالحسن اشعری کا وکیل ہونے کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں اور لاریب یہ بات ان کی زبان پر پھبتی ہے۔

اور فرماتے ہیں: علم کلام جس غرض کی تکمیل کے لیے مدون کیا گیا میرے نزدیک اس نے اس میں پوری

کامیابی حاصل کی۔ اوراب میرا قصد ہے کہ میں اسلامی عقائد کے ہر باب کے متعلق بصورت رسائل عدیدہ یہ دکھلاوں کہ علمائے اسلام نے اس تحقیق کو کس حد تک پہنچا کر چھوڑا ہے۔ اوراب ہم کو اس میں کہاں تک ترمیم یا اصلاح کی ضرورت ہے۔ (کمالات عثمانی: ص ۴۰۰، ۴۰۱)

۳: حدیث وفقہ میں متوازن طریقہ

مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: غرض علمائے دیوبند کے مسلک میں محض قوت سند یا اصح مافی الباب ہونا اصل نہیں، بلکہ بصورت جمع مناطِ حکم اور بصورت ترجیح تفقہ اصل ہے، کیونکہ صحت سند سے زیادہ سے زیادہ حدیث کے ثبوت کی پختگی معلوم ہوسکتی ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جو حدیث زیادہ ثابت ہو وہ اس دائرہ کا بنیادی فقہ بھی اپنے اندر رکھتی ہو۔ پس اگر اصح مافی الباب حدیث لے لی جائے جس میں صرف حکم مسئلہ موجود ہے، اور غیر اصح مگر قابل احتجاج بوجہ غیر اصح ہونے کے ترک کردی جائے جس میں حکم مسئلہ کے ساتھ علت حکم اور مناطِ حکم بھی موجود ہے، تو حکم بلا علت کے رہ جائے گا، اور جبکہ علت حکم ہی سے یہ حکم اپنی دوسری امثال میں بھی پہنچ سکتا تھا جو اس حکم کے پھیلاؤ اور وسعت کی صورت تھی، اور یہ علت محض اس لیے متروک ہوگئی کہ اس کا مأخذ اصح مافی الباب نہ تھا، بلکہ اپنی روایات سے نسبۃً ضعیف السند تھا، تو یقیناً اس حکم کی جامعیت اور مخزن امثال ہونا ختم ہوجائے گا، جس سے فقہ کی وسعت بھی ختم ہوجائے گی اور متبعین کی وسعت فہم بھی باقی نہ رہے گی، اس لیے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ قوتِ سند کے ساتھ اس سے زیادہ مناطِ حکم کی تخریج وتحقیق اور تنقیح وتفقہ روات پر زور دیتے ہیں، جس سے حکم کی قوت بھی نمایاں ہوتی ہے اور وسعت بھی۔۔۔۔۔۔ پھر صحیح روایتیں تو بجائے خود ہیں، ضعیف روایتیں بھی جو قابل احتجاج ہوں ہاتھ سے جانے نہیں پائیں گی۔ اس لیے تطبیق روایات اور جمع بین الروایات حنفیہ کا خاص اصول ہے جس پر وہ زیادہ زور دیتے ہیں، تاکہ کوئی روایت حدیث چھوٹنے نہ پائے، مگر پھر بھی تعصّباً انھیں قیّاس کہہ کر تارکِ حدیث کا خلاف واقعہ لقب دیا جاتا ہے۔ حالانکہ حنفیہ اپنے جامع اصول کے لحاظ سے خود ہی صاحب فقہ نہیں، بلکہ وہ اصولاً تمام فقہوں کے جامع اور محافظ بھی ہیں، اوراسی لیے شاید حضرت الامام الشافعی رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا کہ **الناس فی الفقہ عیال علی ابی حنیفة**۔ البتہ اس جمع بین الروایات اور تحقیق وتنقیح مناط کی وجہ سے حنفیہ کے یہاں بلاشبہ توجیہات کی کثرت ہے کہ اس کے بغیر روایات باہم جڑ کر حکم کا جامع نقشہ نہیں پیش کرسکتیں، مگر یہ توجیہات تاویلات محضہ یا تخمینی باتیں نہیں، بلکہ اصول اور نصوص سے مؤید ہونے کی وجہ سے تقریباً حدیث کی تفسیرات کے ہم پلہ ہوتی ہیں۔ اس لیے حدیث کے بارہ میں علمائے دیوبند کے مسلک کا عنصر وہی جامعیت واعتدال ہے، جس میں نہ تشدد ہے نہ تساہل، بلکہ وہ روایات کے ساتھ تمام ائمہ کے اصول ساتھ لیکر چلتا ہے۔ (علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج: ص ۱۴۹ تا ۱۵۱)

شیخ رشید رضا مصری ۲۷ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ/ ۱۵ اپریل ۱۹۱۲ ام کو دارالعلوم دیوبند تشریف لائے۔اس موقع پر حضرت انور شاہ قدس سرہ نے عربی میں برجستہ ایک گھنٹہ خطاب فرمایا۔علمائے دیوبند کے حدیثی وفقہی منہج کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت نے فرمایا:

غـاية الـمـدرسة (الـديـوبـنـدية) درس الحديثِ وفقة الحديث. وكان يرى (الشيخ محمد قـاسـم الـنـانـوتـوى رحمه الله تعالى) أن المبادى ضرورية، والضرورى يقدر بقدرالضرورة .وطريقة مشـائـخـنـا فِى الحديث وفقه الحديثِ طريقة معتدلة مثلى يتوسطون بين الأطراف. أريد بذلك أن لـلائـمـة الأربعة أُصولا أربعة أكثرية. وذالك إن الامام مالك يتأسى بعمل أهل المدينة، بل قد يرجحه عـلـى الـحـديـث الـمـرفـوع، والشافعى يأخذ بأصح مافى الباب، وأحمد يأخذ بالأصح و الصحيح والـحسن والضعيف إذا كان ضعفه يسيرا. ويجوز هذا وذلك. وعلى هذا وضع مسنده. وأبو حنيفه يـأخـذ بهـذه الأقسـام، ويـنـزل الأحاديث على محامل. فلذا كثرت التأويلات عند الحنيفه، وكثرت الـجـروح عـلـى الراوة عند الشافعية ....فـمشـائـخـنـا يتـوسطون فى مثل هذا، لا يأخذون بالتشدد ولا بـالتسـاهـل، ويـوجهـون الأحاديث المتعارضة بتوجيهات يكاد يقبلها من يسمعها. مثاله حديث الـقـلـتيـن.... ومثـالـه أيـضـا أحـاديـث القرائة خلف الإمام.... وقالوا فى مسئلة رفع اليدين وجهر آمين.... (ماہنامہ الرشید: دارالعلوم دیوبند نمبر: ص ۲۴۳ تا ۲۴۷، ج ۴، ش ۲، ۳، صفر وربیع الاول ۱۳۹۶ھ/ فروری، مارچ ۱۹۷۶ام)

مدرسہ دیوبند کا مقصد حدیث اور فقہ الحدیث کا درس ہے۔شیخ محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ تعالی کی رائے یہ تھی کہ مبادی مقصود لغیر ہا ہیں۔اور ایسی چیز بقدر ضرورت ہی رکھی جاتی ہے۔اور حدیث اور فقہ الحدیث میں ہمارے مشائخ کا طریقہ، معتدل مثالی اور انتہاؤں کے درمیان ہے۔اس سے میری مراد یہ ہے کہ ائمہ اربعہ کے چار اکثری اصول ہیں۔تفصیل یہ ہے کہ امام مالک اہل مدینہ کے عمل کی پیروی فرماتے ہیں، بلکہ اسے حدیث مرفوع پر ترجیح دیتے ہیں۔اور امام شافعی اصح مافی الباب کو لیتے ہیں۔اور امام احمد صحیح، حسن اور ضعیف جس کا ضعف ہلکا ہو، ان سب کو لیتے ہیں۔اور ہر ایک پر عمل درست قرار دیتے ہیں۔اور اسی اصول پر انھوں نے اپنی مسند ترتیب دی ہے۔اور امام ابوحنیفہ ان سب قسموں کو لیتے ہیں اور احادیث سے مناسب معانی مراد لیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ حنفیہ کے ہاں تاویلات کی کثرت ہے۔اور شافعیہ کے ہاں راویوں پر جرحوں کی کثرت ہے۔۔۔۔تو ہمارے مشائخ ان امور میں درمیانہ راستہ اختیار کرتے ہیں۔نہ تشدد اپناتے ہیں اور نہ ہی تساہل کا شکار ہوتے ہیں۔اور احادیث متعارضہ کی ایسی توجیہات پیش کرتے ہیں کہ جنھیں سننے والا قبول کرنے لگتا ہے۔اس کی مثال حدیث قلتین ہے....اور اسکی مثال قراءت خلف الامام کی احادیث بھی ہیں۔۔۔اور ہمارے مشائخ رفع یدین اور آمین بالجہر کے مسئلے میں فرماتے ہیں..

علمائے دیوبند کی تحقیق میں بھی فقہ حنفی اقرب الی الحدیث ہے:

مولانا ظفر احمد عثمانی حضرت تھانوی کا قول نقل کرتے ہیں: مولانا (حضرت نانوتوی قدس سرہ) بڑے

دعوے سے فرمایا کرتے تھے کہ اقوال ابی حنیفہ کو حدیث کے موافق ثابت کرنے کا میں ذمہ لیتا ہوں، لیکن تخریجات فقہاء کا میں ذمہ دار نہیں ہوں۔ جن لوگوں نے مولانا کی تقریر درس حدیث میں سنی ہے وہ اس کے شاہد ہیں کہ واقعی مولانا اقوال ابی حنیفہ کی تقریر ایسی کرتے تھے جن کے بعد وہ بالکل حدیث کے موافق نظر آتے تھے۔ حدیث کو قول ابی حنیفہ کے مطابق نہیں کرتے تھے، کہ اس کا خلاف ادب ہونا ظاہر ہے۔ بلکہ قول ابی حنیفہ کو حدیث کے مطابق کر دیا کرتے تھے۔ (قاسم العلوم: ص۶۳۲، ۶۳۳، مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی، مجلّہ صحیفہ نور، کاندھلہ، مکتبہ سید احمد شہید، لاہور، ط: رمضان ۱۴۲۱ھ/ دسمبر ۲۰۰۰م) حضرت نانوتوی کی ان تقریرات کی ایک جھلک حاشیہ سوانح قاسمی: ۲/ ۲۴۲، ۲۴۳، مولانا مناظر احسن گیلانی، مکتبہ دار العلوم، دیوبند، ط: ۱۳۷۳ھ میں ملاحظہ فرمائیں۔

آپ (حضرت گنگوہی قدس سرہ) بارہا فرمایا کرتے تھے کہ مجھے حنفیہ مذہب سے خاص محبت ہے، اور اس کی حقانیت پر کلی اطمینان ہے۔ (تذکرۃ الرشید: ۱/ ۹۱، مولانا محمد عاشق الٰہی میرٹھی، ادارہ اسلامیات، لاہور، ط: ۱۴۰۶ھ/ ۱۹۸۶م)

حضرت تھانوی کا ارشاد ہے: مذہب حنفی کو بعضے نادان حدیث سے بعید سمجھتے ہیں، مگر مذہب میں اصل چیز اصول ہیں۔ سو ان کے اصول کو دیکھا جائے تو سب مذاہب سے زیادہ اقرب الی الحدیث ہیں.... میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ حنفیہ کے اصول پر نظر نہ کرنے سے ان کو ہمیشہ بدنام کیا گیا ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۵/ ۹۲، ط: ۱۴۲۹ھ)

حضرت انور شاہ قدس سرہ فرماتے ہیں: ہم نے اپنی عمر کے تیس سال یہ دیکھنے کے لیے صرف کر دیے کہ فقہ حنفی حدیث کے مطابق ہے یا نہیں؟ سو ہم اپنی تیس سالہ محنت کے بعد قطعاً مطمئن ہیں۔ جہاں جس درجہ کی حدیث دوسرے فقہاء کے پاس ہے اس درجہ کی حدیث امام ابوحنیفہ کے پاس بھی ہے۔ اور جہاں حدیث نہ ہونے کی بنا پر امام اعظم نے مسئلہ کی بنیاد قیاس و اجتہاد پر رکھی ہے وہاں دوسروں کے پاس بھی حدیث نہیں ہے۔

(نقش دوام: ص ۱۷۵، مولانا انظر شاہ مسعودی، شاہ بک ڈپو، دیوبند، سنہ ندارد)

حضرت گنگوہی قدس سرہ کا مشہور مقولہ ہے کہ حدیث کو جتنی سرسری نظر سے دیکھا جائے گا وہ اتنی ہی حضرات حنفیہ کے خلاف ہوگی۔ اور جتنا حدیث پاک میں توغل کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تمام حدیثیں حنفیہ کے موافق ہیں۔ (تقریر بخاری حضرت مولانا محمد زکریا: ۱/ ۱۲۷، ۱۲۸، ت: مولانا محمد شاہد، مکتبۃ الشیخ، کراچی، ط: سنہ ندارد)

علمائے دیوبند جامد مقلد نہیں، بلکہ تقلید میں محقق ہیں:

مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: پس وہ (علمائے دیوبند) بلاشبہ مقلد اور فقہ معین کے پابند ہیں، مگر اس تقلید میں محقق ہیں، جامد نہیں۔ تقلید ضرور ہے مگر کورانہ نہیں۔ لیکن اس شانِ تحقیق کے باوجود بھی وہ اور ان کی پوری علمی ذریت اپنے کو اجتہاد مطلق کا اہل نہیں سمجھتی۔ البتہ فقہ معین کے دائرے میں رہ کر مسائل کی ترجیح اور ایک ہی دائرہ کی متماثل یا متخالف جزئیات میں سے حسب موقع و محل، اور حسب تقاضائے ظروف زمان و مکان

کسی خاص جزئی کے اخذ وترک یا ترجیح وانتخاب کی حد تک وہ اجتہاد کو منقطع بھی نہیں سمجھتے، اس لیے ان کا مسلک کورانہ تقلید اور اجتہاد مطلق کے درمیان ہے۔ (علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج: ص۱۴۳)

مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: حنفیہ ہمیشہ اس حدیث کو ترجیح دیتے ہیں جو مضمون قرآنی کے موافق ہو، اگرچہ دوسری طرف کے روایت کرنے والے ان کی بہ نسبت زیادہ ثقہ یا تعداد میں زیادہ ہوں۔ (اختلاف الائمہ مع الاستدارک: ص۲۷، ت: مولانا محمد عثمان، مولانا محمد عبدالرزاق، مکتبۃ الحرمین، لاہور، ط: ۱۴۳۱ھ)

اور ارشاد ہے: عمل بالحدیث کرنے والے کا بڑا فرض ہے کہ ان سب (وجوہ ترجیح) کی تحقیق کرنے کے بعد دیکھے کہ کون سی روایت میں وجوہ ترجیح زیادہ پائی جاتی ہیں۔ تاکہ وہ اس کو دوسری متعارض روایات پر ترجیح دے سکے۔ اسی وجہ سے حنفیہ ان روایات کو بھی ترجیح دیتے ہیں جو قوت سند یا علو سند کے لحاظ سے زیادہ راجح نہیں ہوتیں۔ اس لیے کہ حنفیہ کے نزدیک کسی مضمون کا اوفق بالفاظ القرآن ہونا قوی تر وجوہ ترجیح میں سے ہے۔ اور یہ امر نہایت بدیہی ہے اس لیے کہ الفاظ حدیث کا نبی اکرم ﷺ کے الفاظ ہونا یقینی نہیں۔ رواۃ کا بالمعنی حدیث نقل کرنا پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اور الفاظ قرآنی کا بلفظہ منقول ہونا قطعی ہے۔ اس لیے مختلف روایات کے مضمون میں جو مضامین الفاظ قرآنیہ سے زیادہ قریب ہوں گے اس کا راجح ہونا یقینی اور بدیہی امر ہے۔ (مصدر سابق: ص۱۱۴) اس مضمون کی مثالوں سے وضاحت کے لیے دیکھیے: اوجز المسالک: ۲/۹۵، ۹۶، ت: تقی الدین ندوی، دار القلم، دمشق، ط: اولی، ۱۴۲۴ھ/۲۰۰۳م)

یہاں حضرات اساتذہ کرام کی خدمت میں مؤدبانہ گزارش کروں گا کہ حدیث اور فقہ کے درس میں، سادات حنفیہ کے دلائل حدیث کی وضاحت ان کے اپنے اصول کے اجراء اور تمرین کے ساتھ فرمائیں۔ حنفیہ کے اپنے اصول سامنے نہ لانے کی وجہ سے طلبہ کی تشنگی دور نہیں ہوتی۔ وقتی طور پر اگرچہ نہ بولیں، لیکن مروج طریقے سے ان کی تشفی نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں بندہ کے ایک دوسرے مقالے سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ اس کا عنوان ہے: محدثین اور فقہاء کے اصول حدیث کا تقابلی جائزہ۔ یہ مقالہ المصباح لاہور سے مطبوع خیر الاصول کے آخر میں شائع ہوا ہے۔ طلبہ پر یہ ضرور واضح فرمائیں کہ کونسا کلام علی سبیل التسلیم والتنزل ہے، اور کونسا کلام علی سبیل التحقیق والترقی۔

۴: تصوف اور تزکیہ کا اہتمام

مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وہ (علمائے دیوبند) تکمیل اخلاق اور تزکیہ نفس کے لیے حسب سلاسل طریقت مشائخ کی بیعت وصحبت اور طریقت کے اصول وہدایات کی پابندی کو تجربۃً مفید اور ضروری سمجھتے ہیں، لیکن طریقت کو شریعت سے الگ کوئی مستقل راہ نہیں سمجھتے جو سینہ بسینہ چلی آ رہی ہے، بلکہ شریعت کے باطنی اور اخلاقی حصہ کو طریقت کہتے ہیں جو اصلاح قلب کا راستہ ہے، اور جسے شریعت نے احسان کہا ہے، اس لیے

اس کے بنیادی اصول کو کتاب وسنت ہی سے ثابت شدہ جانتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں، مگر اس لائن کے بے اصول یا خلافِ اصول یا من گھڑت رواجی رسوم کو طریقت نہیں سمجھتے، بعض رسوم کے اختیار کرنے کو خلافِ سنت اور بعض کے ارتکاب کو بدعت سمجھ کر قابلِ رد سمجھتے ہیں۔ (علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج: ص ۱۳۰)

حضرت نانوتوی، حضرت گنگوہی، حضرت شیخ الہند، حضرت سہارنپوری، حضرت تھانوی اور حضرت مدنی وغیرہ سب مشائخ دیوبند نے باقاعدہ طور پر بیعت ہوکر سلوک طے کیا۔ اور اصلاح باطن ان حضرات کی دینی خدمات کا ایک اہم باب ہے۔ جیسا کہ ان حضرات کے حالات زندگی کے مطالعے سے واضح ہے۔

حضرت تقی فرماتے ہیں: تمام اکابر دیوبند کا مشترک رنگ یہ تھا کہ وہ حروف ونقوش کے کتابی علم کو اس وقت تک اہمیت نہیں دیتے تھے جب تک اس کے ساتھ انابت الی اللہ اور صلاح وتقوی نہ ہو۔ حکیم الامت حضرت تھانوی نے جب خانقاہ تھانہ بھون میں مدرسہ امداد العلوم قائم فرمایا تو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کو اس کی اطلاع دی۔ حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا: اچھا ہے بھائی، مگر خوشی تو جب ہوگی جب یہاں اللہ اللہ کرنے والے جمع ہو جاویں گے۔ حضرت مولانا محمد یسین صاحب قدس سرہ فرماتے تھے: ہم نے دار العلوم کا وہ وقت دیکھا ہے جس میں صدر مدرس سے لے کر ادنی مدرس تک اور مہتمم سے لے کر دربان اور چپراسی تک سب کے سب صاحب نسبت بزرگ اور اولیاء اللہ تھے۔ دار العلوم اس زمانہ میں دن کو دار العلوم اور رات کو خانقاہ معلوم ہوتا تھا کہ اکثر حجروں سے آخر شب میں تلاوت اور ذکر کی آوازیں سنائی دیتی تھیں، اور درحقیقت یہی اس دار العلوم کا طغرائے امتیاز تھا۔

(اکابر دیوبند کیا تھے؟ ماہنامہ دار العلوم (دیوبند): ص ۵۱، ۵۲، ملخصا، نومبر ۲۰۱۰م، ماہنامہ الرشید: ص ۱۴۵)

مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں: ہمارے طالب علمی اور بچپن کے زمانے میں اس کا بڑا اہتمام تھا کہ نو دس سال رہ کر ایک طالب علم نے علم حاصل کرلیا، لیکن اکابر اس کو سند نہیں دیتے تھے، جب تک جماعت کے بزرگوں میں سے کسی کے پاس چھ مہینے رہ کر اپنی اصلاح نہ کرائے، اور صحبت یافتہ ہو کر اس کا رنگ نہ قبول کرلے۔ اس کے بغیر وہ سند نہیں دیتے تھے، کیونکہ صحبت کے بغیر (علم) محض ایک نمائش اور گرمی بازار اور گرمی محفل کا ذریعہ رہ جاتا ہے۔ (خطبات حکیم الاسلام: ۱۲/۱۷۶، مرتب: مولانا محمد ادریس ہوشیار پوری، ت: مولانا ابن الحسن عباسی وغیرہ علماء، بیت السلام پبلشر، کراچی، ط: ۲۰۱۱م)

حضرت تھانوی فرماتے ہیں: جس زمانہ میں میں مدرسہ دیوبند پڑھتا تھا اس وقت کے حالات وواقعات یاد آ آ کر عجیب قلب کی کیفیت ہوتی ہے۔ اس وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہمیشہ ایسا ہی زمانہ رہے گا۔ اس وقت بڑے بڑے اہل کمال کا اجتماع تھا۔ اور قریب قریب سب اپنے کو مٹائے ہوئے تھے اور فنا کیے ہوئے تھے۔ جب کبھی اتفاق سے ان حضرات کا اجتماع ہو جاتا تھا یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہر بزرگ دوسرے کو اپنے سے بڑا سمجھتا ہے۔ بڑی ہی خیر کا مجمع

تھا۔ یہی حالت آپس میں طلباء کی تھی۔ اور اساتذہ کے سامنے تو بولنے کی بھی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اور ایک یہ زمانہ ہے کہ اس وقت سے کوئی مناسبت ہی نہیں۔ چہ نسبت خاک را بعالم پاک۔ اس وقت کھلم کھلا نظر آتا تھا کہ مدرسہ پر انوار کی بارش ہو رہی ہے۔ اور یہ سب ان حضرات کی مقبولیت کی علامت تھی۔ اور ان حضرات کے تقوی اور طہارت کے ثمرات تھے۔ اور مدرسہ کی مقبولیت کا اس قدر جو اثر ساری دنیا پر ہوا یہ بھی ان ہی حضرات کی برکت تھی۔ مقبولیت پر یاد آیا۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے خواب میں دیکھا کہ جنت ہے اور اس میں ایک طرف چھپر کے مکان بنے ہوئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں نے دل میں کہا اے اللہ! یہ کیسی جنت ہے جس میں چھپر ہیں۔ جس وقت صبح کو مدرسہ آیا مدرسہ کے چھپر نظر پڑے تو ویسے ہی چھپر تھے۔ یہ زمانہ مدرسہ کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ تب تعبیر سمجھ آئی کہ یہ مدرسہ کی مقبولیت دکھائی گئی ہے۔ اس زمانہ میں نہ یہ لمبی چوڑی تعمیر تھی، نہ اساتذہ تزک اور شان سے رہتے تھے۔ نہ طلباء کا کوئی فیشن تھا۔ پھٹے کپڑے، ٹوٹی ہوئی جوتیاں، یہ ان کا ظاہری حال تھا۔ نہ اس جدید قسم کے قواعد اور قانون تھے۔ نہ اتنے ممبر اور محراب تھے۔ کام جو کچھ ہوا سب کو معلوم ہے کہ کیسے کیسے باکمال لوگ فارغ ہو کر نکلے۔ اور اب اس وقت سب کچھ ہے، اور اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ وہ جو ایک چیز تھی جس کو روح کہتے ہیں وہ نہیں رہی۔

(ملفوظات حکیم الامت: ۱/۹۶، ۹۷، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ط: ۱۴۲۳ھ)

اپنی اصلاح باطن کا اہتمام کیے بغیر دوسروں کو دینی نفع پہنچانے کے درپے ہونے میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ یہ بات تجربے اور مشاہدے سے بھی ثابت ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی جاننے والے جانتے ہیں کہ جہاں شخصیت کی تعمیر اور فرد کی اصلاح کیے بغیر اسے دوسروں کی دینی خدمات میں مشغول کر دیتے ہیں وہاں کیا کیا فسادات پیدا ہو رہے ہیں!! اور انکا حل کتنا دشوار ہو رہا ہے!! مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالی کے الفاظ ملاحظہ ہوں: تجربہ ہے کہ دنیا میں جتنے فتنے پھیلے ہیں، جس سے مذاہب اور پارٹیاں بن جاتی ہیں، یہ زیادہ تر ان علماء سے پھیلے ہیں جو صحبت یافتہ نہیں ہوتے۔ فقط قرآن وحدیث کے الفاظ ان کے سامنے ہوتے ہیں۔ اسلاف کا وہ رنگ ان کے قلوب میں نہیں ہوتا جو بزرگوں میں ہوا کرتا ہے، اس لیے ان سے فتنہ زیادہ پھیلتا ہے۔ جو عالم زیادہ صحبت یافتہ ہوگا، زیادہ دیانت قائم کیے ہوئے ہوگا اس سے فتنہ نہیں پھیلے گا۔ زیادہ فتنہ پرداز وہ ہوتے ہیں کہ ان کے پاس علم موجود ہوتا ہے، صحبت میسر نہیں ہوتی، اخلاق درست نہیں ہوتے، اخلاق کے اندر پختگی نہیں پیدا ہوتی، تو ان کے کلمات سے زیادہ تر بے ادبی اور گستاخی کا فتنہ پھیلتا جاتا ہے۔ یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ مصر، شام یا عراق (میں) ہوا، اول تو وہاں علم کی ہی کمی ہے، لیکن اگر علم بھی ہے تو چونکہ صلحاء اور اہل اللہ کی صحبت میسر نہیں وہ علم وبال جان اور مار آستین ان کے حق میں بنا ہوا ہے۔ بقول حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ:

علم را بر تن زنی مارے بود　　　علم را بر دل زنی یارے بود

علم کو نوک زبان پر رکھو گے تو سانپ اور بچھو ہے، یہ ڈسے گا۔ اور علم کو دل میں اتارو گے تو یار اور دوست بن جائے گا، جو آخرت تک پہنچائے گا۔ (خطبات حکیم الاسلام: ۱۲/ ۱۷۶، ۱۷۷)

حضرت تھانوی کا ارشاد ہے: میں نے بار بار یہ کہا ہے کہ پہلے اپنی ظاہری اور باطنی قوت کو دیکھ لو۔ اس کے بعد ایثار کرو اور دوسروں کے کاموں میں پڑو، مگر اپنا نقصان کر کے اور دین کو برباد کر کے دوسروں کے کاموں میں لگنا اور اصلاح غیر کے درپے ہونا یہ حضرات صحابہ سے کہاں ثابت ہے؟ اور اس پر کہاں مدح کی گئی ہے؟ اس آیت (**والذین تبوؤا الدار والایمان من قبلھم ۔۔۔**) میں اللہ تعالیٰ نے حضرات صحابہ کی اول تعریف اس پر کی ہے کہ وہ اپنے نفس کی تکمیل کر چکے ہیں اور ایمان کو اپنے دلوں میں جما چکے ہیں اور نفس کو حرص وغیرہ سے پاک کر چکے ہیں۔ اس کے بعد ایثار پر مدح کی گئی ہے۔ اس سے خود میرے بیان کی تائید ہو رہی ہے کہ اصلاح نفس اصلاح غیر سے مقدم ہے اور یہ کہ ایثار کی اسی کو اجازت ہے جو اپنی اصلاح سے فراغت کر چکا ہو۔ اب وہ مولانا صاحبان غور کر لیں جو اصلاح غیر کے درپے ہیں، کیا وہ اپنی اصلاح و تکمیل سے فارغ ہو گئے ہیں؟ اگر وہ سچ بولیں گے تو ضرور یہ کہیں گے کہ فراغت تو کہاں ابھی تو اپنی اصلاح کی ابتداء بھی نہیں ہوئی۔ میں اسی حالت کو مرض کہہ رہا ہوں اور اسی سے منع کر رہا ہوں۔ (خطبات حکیم الامت: ۲۵/ ۱۷۶، ت: صوفی اقبال، مولانا زاہد محمود، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ط: ۱۴۲۹ھ)

**۵: دین کے دفاع کی طرف خصوصی توجہ**

مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: دارالعلوم کی جماعت اپنے مسالک کی ہمہ گیری کی وجہ سے ہر فتنہ کی مدافعت کی لیے سینہ سپر رہی۔ خواہ وہ فتنہ نقل و روایت کی راہوں سے آیا یا عقلیت پسندی کی بنیاد سے اٹھا۔ اس جماعت نے ہمیشہ اعلائے کلمۃ اللہ اور امر بالمعروف کا فرض ادا کیا اور اسی اسلوب اور اسی رنگ میں جس رنگ ڈھنگ میں کسی دینی فتنہ نے سر اٹھایا۔ (ماہنامہ الرشید: ص ۱۵۱ تا ۱۵۷ ملخصا)

ہندوستان پر انگریزوں نے تسلط جمانے کے بعد یہاں پر عیسائی مذہب کی تبلیغ کی کوششیں تیز کر دیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ تھی کہ ایک بڑا جلسہ رکھا گیا جس میں ہندو پنڈتوں کو دعوت دی گئی، عیسائی پادری بلوائے گئے، اور مسلمان علماء کو بھی دعوت دی گئی۔ غرض یہ تھی کہ اگر جلسے میں اسلام پر اعتراض کر کے مسلمان علماء کو چپ کرا دیا گیا تو مسلمانوں کو ان کے دین سے ہٹانا آسان ہوگا۔ چنانچہ ان میں سے پہلا جلسہ میلہ خدا شناسی ۱۲۹۳ھ/ ۱۸۶۷م کو شاہجہانپور میں ہوا۔

پہلے میلہ خدا شناسی میں حضرت قاسم العلوم والخیرات حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ نے جو تقریر فرمائی اس کے بارے میں پادری اینک نے کہا:

کیا پوچھتے ہو؟ ہم کو بہت سے اس قسم کے جلسوں میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا۔ اور بہت سے علمائے

اسلام سے اتفاق گفتگو ہوا۔ پر نہ یہ تقریریں سنیں، نہ ایسا عالم دیکھا۔ ایک پتلا دبلا سا آدمی، میلے سے کپڑے، یہ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ کچھ عالم ہیں۔ ہم جی میں کہتے تھے کہ یہ کیا بیان کریں گے؟ یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ حق کہتے تھے، پر اگر تقریر پر ایمان لایا کرتے تو اس شخص کی تقریر پر ایمان لے آتے۔ اور پھر یہ کہا کہ تقدیر کے مسئلہ کو پادری جب چھیڑا کرتے ہیں جب کوئی تدبیر غلبہ کی باقی نہیں رہتی۔ پادری نولس صاحب نے لاچار ہوکر یہ باتیں شروع کی تھیں، پر اس شخص نے ایسا ان سب کو اڑایا کہ پتا نہ لگنے دیا۔ (واقعہ میلہ خدا شناسی: ص ۴۰، مطبع مجتبائی، دہلی، ط: ۱۳۱۲ھ)

میلہ برخاست ہوا۔ باہر آتے ہی مولوی محمد قاسم صاحب کے گرد ایک ہجوم تھا ہندو مسلمان سب گھیرے کھڑے تھے۔ مسلمانوں کی اس وقت جو کیفیت تھی سو تھی، مگر ہنود بھی بہت خوش تھے۔ آپس میں کہتے تھے نیلی لنگی والے مولوی (حضرت نانوتوی) نے پادریوں کو خوب مات دی۔ (مصدر سابق: ص ۴۷) حضرت نانوتوی قدس سرہ کے مناظروں کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: سوانح قاسمی: ۲/ ۳۵۸ تا ۴۶۳، مولانا مناظر احسن گیلانی، بانی دار العلوم دیوبند: ص ۲۳ تا ۳۸، مولانا محمد سرفراز خان صفدر)

اہل زیغ وضلال کے شبہات واعتراضات کے مدلل اور شافی جواب دینا، دیگر حضرات اکابرین دیوبند کی تحریر وتقریر کا بھی ایک اہم موضوع رہا ہے۔ اور یہ درحقیقت ارشاد خداوندی **وجادلھم بالتی ھی احسن** کا عملی مظاہرہ ہے۔

دین کے دفاع میں یہ بھی داخل ہے کہ دین کی صحیح تشریحات سے متصادم جو بھی تحریر اور تقریر ہوا سے صاف طور پر ظاہر کر دیا جائے۔ اس کا ایک واقعہ دیکھیے! مولانا محمد میاں صدیقی لکھتے ہیں: سید صاحب (مولانا سید سلیمان ندوی) جب بھی لاہور تشریف لاتے، جامعہ اشرفیہ کے مہمان خانے میں ٹھہرتے۔ والد صاحب قبلہ (مولانا محمد ادریس کاندھلوی) کے ساتھ علمی گفتگو رہتی۔ علم کلام پر سید صاحب نے ایک کتاب لکھی۔ اس کا مسودہ لے کر آئے۔ کئی روز لاہور قیام رہا۔ مسودہ کے اکثر حصے والد صاحب کو سنائے۔ والد صاحب نے اس کے بعض حصوں پر تنقید کی اور فرمایا کہ سید صاحب! آپ کی یہ تحریر مسلک اہل سنت والجماعت سے ہٹی ہوئی ہے۔ سید صاحب اس وقت خاموش رہے۔ تین چار روز بعد کراچی جانے لگے تو والد صاحب اور مولانا خیر محمد جالندھری سید صاحب کو رخصت کرنے سڑک تک آئے۔ (ناچیز راقم بھی موجود تھا)۔ سید صاحب جب گاڑی میں سوار ہونے لگے تو مسکرا کر فرمایا: میں نے علم کلام پر جو مسودہ مرتب کیا تھا اب اسے چھپوانے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے، کچھ اللہ میاں کے ڈر سے، اور کچھ مولوی ادریس کے ڈر سے۔ اور پھر واقعی سید صاحب نے وہ مسودہ طبع نہیں کرایا۔ (تذکرہ مولانا محمد ادریس کاندھلوی: ص ۲۶۷، ۲۶۸، مولانا محمد میاں صدیقی، مکتبہ عثمانیہ، جامعہ اشرفیہ، لاہور، ط: اول ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۷ء)

۶: تدریس وافتاء

علم دین میں گہرائی اور گیرائی کے لیے ایک طویل عرصے تک علمی مشغلے میں انہماک کی ضرورت ہوتی

ہے۔اس کی عمدہ صورت تدریس اور افتا میں مشغول ہونا ہے۔ان سے ایک طرف پڑھانیوالے اور فتوی بتانے والے کو علمی وسعت اور پختگی حاصل ہوتی ہے،اور دوسری طرف دین کی صحیح سمجھ بوجھ رکھنے والی جماعت تیار ہوتی ہے،اور عامۃ المسلمین تک دین کے احکام پہنچتے ہیں۔مشائخ دیوبند کو تدریس وافتا کا خاص ذوق رہا ہے۔

دار العلوم دیوبند میں ممتاز علمی اور عملی خوبیوں والے اساتذہ کرام اپنے اپنے وقت کے صدر مدرس رہے ہیں۔چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی،حضرت مولانا سید احمد دہلوی،حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی،حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری،حضرت مولانا حسین احمد مدنی،اور حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی رحمہم اللہ تعالی اپنے اپنے وقت کے صدر مدرس رہے ہیں۔

اور مفتی کے طور پر خدمات سرانجام دینے والے حضرات میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی،مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی،مولانا محمد اعزاز علی،مولانا ریاض الدین،مفتی محمد شفیع،مولانا محمد سہول،مولانا محمد کفایت اللہ میرٹھی،مولانا محمد فاروق امبیٹھوی،مولانا مہدی حسن شاہ جہانپوری وغیرہ حضرات شامل ہیں۔

(ماخذہ: تاریخ دار العلوم دیوبند: ص ۹۷-۱۰۰ ملخصا)

اساتذہ دیوبند کی درسی امالی سے ان حضرات کی علمی جامعیت اور تحقیق کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ اور فقہی مہارت کے لیے فتاوی رشیدیہ،فتاوی خلیلیہ،عزیز الفتاوی،امداد الفتاوی،امداد الاحکام،فتاوی دار العلوم دیوبند،جواہر الفقہ،اور امداد المفتین وغیرہ کتب کافی ثبوت ہیں۔

مولوی ظفر احمد صاحب نے ایک مرتبہ (حضرت سہارنپوری) سے عرض کیا کہ حضرت فقہ سے مناسبت پیدا ہونے کی کوئی صورت ارشاد فرمائیں۔فرمایا مفتیوں کی عادت یہ ہے کہ صرف استفتاء آنے کے وقت کتابیں دیکھتے ہیں۔اس سے کام نہیں چلتا۔اور جواب میں بہت غلطی ہو جاتی ہے۔کیونکہ اس وقت جلدی میں ایک جگہ کو دیکھ کر جواب لکھ دیتے ہیں،حالانکہ دوسرے مقام میں اس مسئلہ کے اندر تفصیل معلوم ہوتی ہے جس سے اس واقعہ مسئولہ کا حکم بدل جاتا ہے۔پس فقہ سے مناسبت پیدا کرنے کے لیے شامی اور بدائع کو بالاستیعاب دیکھنا چاہیے۔ہمارے حضرت گنگوہی نے شامی کو کئی بار بالاستیعاب ملاحظہ فرمایا ہے۔حقیقت میں بدائع عجیب کتاب ہے۔جزئیات تو زیادہ شامی میں ہیں،مگر اصول اور فقہ کی لم زیادہ بدائع میں ہیں،کہ اس سے مناسبت ہو جائے تو فقہ میں طبیعت چلنے لگے۔

(تذکرۃ الخلیل: ص ۲۹۴ ملخصا، مولانا محمد عاشق الٰہی میرٹھی، مکتبۃ الشیخ، کراچی، ط: سنہ ندارد)

حضرت نانوتوی قدس سرہ کے سبق پڑھانے کی کیفیت حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمہ اللہ تعالی کی زبانی ملاحظہ ہو: اس زمانہ میں پڑھانا اکثر تھا،سب کتابیں بے تکلف پڑھاتے تھے،اور اس طرح کے مضامین بیان فرماتے تھے کہ نہ کسی نے سنے،نہ سمجھے۔اور عجائب غرائب تحقیقات ہر فن میں بیان فرماتے،جس سے تطبیق اختلافات

اور تحقیق ہر مسئلہ کی بیخ و بن تلک ہو جاتی تھی۔ (حالات طیب: ص۵۰، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، ت: مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی، مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، یوپی انڈیا، ط: ۱۴۳۵ھ)۔ اور فرماتے ہیں: مولوی صاحب سے پڑھنا نہایت ہی دشوار تھا، جو شخص طباع ہو اور پہلے سے اصل کتاب سمجھا ہوا ہو تب مولوی صاحب کی بات سمجھ سکتا تھا۔ ہر چند مولوی صاحب نہایت ہندی کی چندی کر کر بیان فرماتے، مگر پھر مشکل بات مشکل ہی ہوتی ہے۔ (مصدر سابق: ص۵۲)

(حضرت) مولانا محمود حسن (شیخ الہند) فرماتے تھے کہ میں نے اس کا التزام کیا کہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف دیکھ کر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے درس (سبق) میں حاضر ہوتا۔ اور وہ باتیں پوچھتا جو حضرت شاہ صاحب کی کتب میں مشکل ہوتی تھیں، لیکن شاہ صاحب کی کتب میں جو انتہائی جواب ہوتا تھا وہ حضرت نانوتوی اول ہی دفعہ میں فرما دیتے تھے۔ بارہا اس کا تجربہ کیا! (ارواح ثلاثہ: ص۲۰۵، مکتبۃ الحسن، لاہور، ط: سنہ ندارد)

حضرت گنگوہی قدس سرہ کی تحدیث (حدیث پڑھانے) میں یہ خاص برکت تھی کہ مضمون حدیث سن کر اس پر عمل کرنے کا شوق پیدا ہو جاتا تھا۔ یہ خاص روحی اثر اس کا پتہ دے رہا تھا کہ یہ تحدیث کتابی نہیں ہے، بلکہ حضرت قدس سرہ کے چشمان دل صفا منزل کے سامنے ایک آئینہ لگا ہوا ہے جس میں صاحب حدیث علیہ السلام کے انوار کا عکس پڑتا ہے اور اس انعکاسی تجلی سے حضرت اپنے طلبہ کو متمتع فرما رہے ہیں۔ آپ کی تدریس میں ایسا محویت کا عالم ہوتا تھا کہ بے اختیار دل خواہش کرتا کہ کاش تقریر کا سلسلہ دیر تک ختم نہ ہو۔ حضرت کی تقریر ایسی سلیس عام فہم ہوتی کہ پاس بیٹھے ہوئے عامی لوگوں کو بھی حرفاً حرفاً سمجھ میں آتی اور دل کے کواڑ کھولتی چلی جاتی تھی۔ اسناد حدیث کے متعلق پوری تحقیق فرماتے تھے۔ اختلافات احادیث اور تعارض کے متعلق مختصر مگر جامع تطبیق فرماتے تھے کہ ذرہ بھر گل چھٹ اور حبہ برابر الجھن باقی نہ رہتی تھی۔ آپکی تقریر میں ایک عجیب کرامت تھی کہ وسیع تقریر اور بلیغ تحقیق کی طرف دیکھا جاتا تو خیال ہوتا تھا کہ سبق بہت کم ہوا، لیکن اوراق و صفحات شمار کیے جاتے تو حیرت ہوتی کہ اس قدر سبق کیونکر ہو گیا؟ آپ کی تقریر کے بعد حواشی بالکل بے کار معلوم ہوتے تھے اور یوں خیال ہوتا تھا کہ جب رسول مقبول ﷺ یا آپ کے صحابی نے اس حدیث کو بیان فرمایا ہوگا تو ہمارے حضرت وہیں کسی جگہ کھڑے سن رہے ہوں گے۔ (تذکرۃ الرشید: ۱/۸۹، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، ادارہ اسلامیات، لاہور، ط: ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء، حضرت گنگوہی قدس سرہ صحاح ستہ کا دورہ حدیث شریف اکیلے خود ہی پڑھایا کرتے تھے۔ تفصیل کے لیے تذکرۃ الرشید، عنوان: تدریس و دورہ حدیث کی مراجعت فرمائیں)۔

۷: دعوت و ارشاد

مولانا احمد حسن صاحب بڑے معقولی تھے اور کسی کو اس میدان میں اپنا ہم سر نہیں سمجھتے تھے۔ ایک دن حضرت نانوتوی قدس سرہ کا وعظ ہوا اور اتفاق سے سامنے وہی تھے اور مخاطب بن گئے۔ اور معقولات ہی کے مسائل کا

رد شروع ہوا۔ وعظ کے بعد انھوں نے کہا اللہ اکبر! یہ باتیں کسی انسانی دماغ کی نہیں ہوسکتیں۔ یہ تو خدا ہی کی باتیں ہیں۔ مجھ پر تو یہ اثر ہوا ہے کہ خودی مٹ رہی ہے۔ اس مجلس میں حضرت سے بیعت کی درخواست کی۔ فرمایا کہ حضرت حاجی صاحب کی طرف سے بیعت کرتا ہوں، جب آپ وہاں جائیں تو پھر وہاں تجدید بیعت کرلیں۔ چنانچہ جب مولانا گئے تو حضرت حاجی صاحب سے تجدید بیعت کرلی۔

حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہ کا ایک وعظ سہارنپور میں ہوا، جس میں مولانا محمد مظہر نانوتوی بھی شریک تھے اور ختم وعظ پر فرمانے لگے کہ بھلا ان کے ہوتے ہوئے کوئی واعظ وعظ کہہ کر کیا ایسی تیسی کھائے گا! یہ علوم کہاں سے لائے گا؟ یہ اثر کہاں سے آئے گا؟ (ارواح ثلاثہ: ص ۲۱۱، ۲۱۲)

مدرسہ دیو بند کے ایک سالانہ جلسے میں حضرت گنگوہی قدس سرہ کے وعظ کا واقعہ ملاحظہ ہو: جمعہ کی نماز کے بعد جامع مسجد میں (حضرت گنگوہی قدس سرہ نے) وعظ فرمایا۔

وعظ کیا تھا **ان من البیان لسحرا** کا مصداق تھا، اور بیان کیا تھا محبت الٰہی کا دریائے مواج اور قلزم متلاطم تھا، جس نے اس کنارے سے لے کر اس کنارے تک ہر صغیر و کبیر کی حالت کو دگرگوں کر دیا تھا۔ آپ حدیث کی کتاب ہاتھ میں لے کر منبر پر بیٹھے اور کیف ما اتفق اسے کھول کر جو حدیث نظر پڑی اس کو پڑھ کر ترجمہ فرمانے لگے۔ آپ کے سارے وعظ میں حدیث نبوی کا سادہ ترجمہ اور یہی نماز روزے کے مسائل تھے جو معمولی پڑھے لکھے بھی بیان کر دیتے ہیں، مگر خدا جانے وہ غیبی تاثیر کیا تھی جس نے سارے جلسے کو ساکت و صامت اور مبہوت و سرنگوں بنا رکھا تھا۔ ہر شخص اس قلبی فیضان سے متاثر تھا اور مسجد کی دیواریں تک مست و سرشار نظر آتی تھیں۔

حضرت مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ نے اس وعظ کی چشم دید کیفیت کو سالانہ روئیداد میں مختصر الفاظ کے ساتھ اس طرح تحریر فرمایا ہے کہ: وعظ کیا تھا گویا سامعین کو مے محبت الٰہی کے خم کے خم پلا دیے۔ در و دیوار تک مست تھے۔ اور عجیب کیفیت ظاہر تھی کہ کہیں دیکھی نہ سنی۔ اللہ اللہ اس کے خاص بندوں کے سیدھے سیدھے الفاظ اور سادہ بیان اور ڈھیلی ڈھیلی زبان میں کیا کیا تاثیرات ہیں کہ بشر کیا شجر و حجر بھی مان جاتے ہیں۔ مولانا نے کوئی دقیق مضامین علمیہ بیان نہیں فرمائے۔ یہی وضو اور نماز کے مسائل بیان کیے۔ اور اخلاص کے بیان میں کسی تقریب سے ایک دفعہ بآواز بلند اللہ کہا۔ معلوم نہیں کس دل اور کیسے گداز سے اللہ کا نام لیا کہ تمام مجلس وعظ لوٹ گئی۔ اور آہ و زاری کی آواز سے مسجد گونج اٹھی۔ ہر شخص اپنے حال میں مبتلا تھا۔ اس وقت بعض اشخاص نے مولوی صاحب کو دیکھا کہ کمال وقار سے منبر پر خاموش بیٹھے ہیں اور اہل مجلس کی طرف متوجہ ہیں۔ یقین ہوتا ہے کہ اگر مولوی صاحب ایسے متوجہ نہ ہوتے تو اہل مجلس کو دیر تک افاقہ نہ ہوتا، مگر اللہ رے حوصلہ کہ خود ویسے ہی مستقل رہے۔ سینہ میں قلزم کو لے قطرہ کا قطرہ ہی رہا۔ انتہی

سنا ہے کہ وعظ سے پہلے مجمع میں واعظین کی تقاریر اور تاثیرات کا تذکرہ ہو رہا تھا کہ بعض وعظ کہنے والے بیان وتقریر کا اس درجہ ملکہ رکھتے ہیں کہ حاضرین کا ہنسا دینا اور رلا دینا گویا ان کے اختیار میں ہے کہ جب چاہا ہنسا دیا اور جس وقت رنگ بدلنا چاہا تو رلا دیا۔ حضرت امام ربانی نے بھی گفتگو سنی اور بات ٹالنے کے لیے یوں ارشاد فرما کر خاموش ہو گئے تھے کہ ہاں اللہ کے بندوں کے نزدیک یہ کوئی چیز نہیں گنی جاتی۔ رلانا اور ہنسانا بات ہی کیا ہے؟ اخلاص کے ساتھ اللہ کا نام بھی نکلے تو اس پر مخلوق رونے لگے۔ چنانچہ چند ہی ساعات کے بعد وعظ میں وہ مضمون جو علم الیقین تھا، عین الیقین بن گیا۔ (تذکرۃ الرشید: ۱/۲۵۰، ۲۵۱ ملخصا)

ایک مرتبہ جامعہ اشرفیہ کے سالانہ جلسہ میں والد صاحب (مولانا محمد ادریس کاندھلوی) نے تقریر کی۔ صدارت سید صاحب (مولانا سلیمان ندوی) کی تھی۔ سید صاحب نے پوری تقریر بڑے غور سے سنی اور بعد میں فرمایا: مولانا آپ کی تقریر مکمل تھی، مدلل تھی، مسلسل تھی۔ ایک بار فرمانے لگے: مولانا دل چاہتا ہے آپ کا علم چرا لوں۔ کئی اہل علم نے بیان کیا کہ سید صاحب سے اگر کوئی تفسیر یا حدیث کے متعلق سوال کرتا تو فرماتے کہ مولوی ادریس صاحب سے رجوع کریں۔ (تذکرہ مولانا محمد ادریس کاندھلوی: ص ۲۶۸)

تحریری شکل میں اگر مواعظ دیکھنے ہوں تو خطبات حکیم الامت (حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی)، ۳۲/جلدوں میں ادارہ تالیفات اشرفیہ سے مطبوع ہیں۔ اور اصلاح وارشاد کی ایک بہترین مثال ملفوظات حکیم الامت بھی ۳۲/جلدوں میں اسی ادارے سے مطبوع ہیں۔ اور حضرت تھانوی کی کتاب تربیت السالک، مشائخ دیوبند کے طب باطن کا ایک مثالی نمونہ ہے۔

حضرت اقدس (تھانوی) ہمیشہ سے اسلامی مدارس کو اس طرف توجہ دلاتے رہتے ہیں کہ تبلیغ کا اہتمام بھی تعلیم کی طرح ضرور رَکھا جائے۔ چنانچہ خانقاہ کی طرف سے بہت عرصہ سے تبلیغ کا سلسلہ جاری فرما رکھا ہے، گو کسی خاص عارض کے سبب بعض مرتبہ کوئی مبلغ نہیں رہتا، لیکن جب موقع ہوتا ہے پھر رکھ لیا جاتا ہے۔ غرض تبلیغ کا حضرت والا کو ہمیشہ اہتمام رہتا ہے۔ بسا اوقات فرمایا کرتے ہیں کہ تمام تعلیم وتعلم کا اصل مقصد تبلیغ ہی ہے۔ حضرات انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کا یہی فرض منصبی تھا۔ (اشرف السوانح: ۳/۲۴۴، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ط: ۱۴۱۴ھ) حضرت تھانوی کے دعوتی اور تبلیغی اسفار کی کچھ تفصیل کے لیے دیکھیے: اشرف السوانح: ۳/۲۳۳-۲۴۱، اور کارکنان تبلیغ کے لیے مولانا محمد الیاس صاحب کی مفید باتیں اور اہم ہدایات: ص ۴۶-۴۸، مفتی محمد زید مظاہری)

اس کے بعد حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالی کے تبلیغی قافلوں کی چلت پھرت بھی اس دور میں دین کی عمومی دعوت کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اور اس سے بھی مجموعی طور پر بہت اچھے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں: ہماری اس تحریک کا اصل مقصد ہے مسلمانوں کو **جمیع ماجاء به النبی** ﷺ سکھانا (یعنی اسلام کے

پورے علمی اور عملی نظام سے امت کو وابستہ کر دینا) ۔ یہ تو ہمارا مقصد ہے ۔ رہی قافلوں کی چلت پھرت اور تبلیغی گشت، سو یہ اصل مقصد کے لیے ابتدائی ذریعہ ہے اور کلمہ و نماز کی تلقین و تعلیم گویا ہمارے پورے نصاب کی الف بے تے ہے ۔ (ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس :ص ۲۹، مولانا محمد منظور نعمانی ، مدنی کتب خانہ، کراچی ، سنہ ندارد) اور فرماتے ہیں: ہمارے نزدیک اس وقت امت کی اصل بیماری دین کی طلب وقدر سے ان کے دلوں کا خالی ہونا ہے ۔ اگر دین کی فکر وطلب ان کے اندر پیدا ہو جائے تو ان کی اسلامیت دیکھتے دیکھتے سرسبز ہو جائے ۔ ہماری اس تحریک کا اصل مقصد بس دین کی طلب وقدر پیدا کرنے کی کوشش کرنا ہے، نہ کہ صرف کلمہ اور نماز وغیرہ کی تصحیح و تلقین ۔ (مصدر سابق :ص ۶۷)

۸: تصنیف و تالیف

کتابی شکل میں دین کی تشریحات کو محفوظ کرنا بھی دینی خدمات کا ایک اہم شعبہ ہے ۔ دین کو اصلی حالت میں باقی رکھنے میں تصنیف و تالیف کا کلیدی کردار ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے امت نے ہر دور میں اس دینی ضرورت کو بہترین طریقے سے پورا کیا ہے ۔ علمائے دیوبند نے بھی اس روایت کا تسلسل اعلیٰ ترین معیار پر باقی رکھا ہے ۔ اس بارے میں محترم جناب سید مشتاق علی شاہ نے ایک مختصر فہرست مرتب کی ہے ۔ اس رسالے کا نام ہے: علمائے اہل سنت کی تصنیفی خدمات کی ایک جھلک ۔ یہ رسالہ مکتبہ فاروقیہ، گوبند گڑھ گوجرانوالہ سے مطبوع ہے ۔ حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحی عارفی نے فہرست تالیفات حکیم الامت کے نام سے ایک ضخیم جلد مرتب فرمائی ہے ۔ جو مکتبہ دار العلوم کراچی سے ۱۴۰۷ھ میں طبع ہوئی تھی ۔ مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالی نے تاریخ دار العلوم دیوبند ص ۵۱، ۵۲ پر مشہور علماء دیوبند کا تصنیفی رنگ ذکر فرمایا ہے ۔

حضرت نانوتوی کی تالیفات کا مجموعہ مقالات حجۃ الاسلام کے نام سے ۱۷/ جلدوں میں، اور حضرت تھانوی کی تصانیف کا ایک مجموعہ مقالات حکیم الامت کے نام سے ۳۴/ جلدوں میں حال ہی میں ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان سے طبع ہوئے ہیں ۔ حضرت گنگوہی کے رسائل کا ایک مجموعہ تالیفات رشیدیہ کے نام سے ادارہ اسلامیات لاہور سے مطبوع ہے ۔ حضرت انور شاہ کشمیری کے رسائل **مجموعة رسائل الكشميری** کے نام سے ۴/ جلدوں میں ادارۃ القرآن کراچی سے مطبوع ہیں ۔

۹: سیاسیات میں شرکت

مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: علمائے دیوبند آج کی غیر شرعی سیاست کے ہجوم میں بھی ملکی معاملات اور سیاسیات کلیۃً بیگانہ یا الگ تھلگ نہیں رہے ۔ بلکہ شرعی حدود میں رہ کر تا بحد امکان اس میں بھی حصہ لیا، مگر مدافعانہ انداز میں ۔ ۱۸۵۷ء میں لوجہ اللہ الگ استخلاص وطن کے لیے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ بانی دارالعلوم دیوبند نے جنگِ آزادی میں قائدانہ حصہ لیا ۔ توپ و تفنگ سے انگریزوں کا مقابلہ کیا اور بازیافت

وطن کی ایک مثال قائم کردی۔ خلافتِ ترکیہ پر روسی یلغار کے وقت حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے خلافت کی بقاء اور تحفظ پر مسلمانوں کی آواز کو متحد بنایا اور ترکوں کی مالی امداد کے لیے نہ صرف چندہ کر کے ہزار ہا روپیہ ہی ترکوں کی امداد کے لیے بھجوایا، بلکہ خود اپنے گھر بار کا اثاثہ بھی اسی امداد میں لگا دیا۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد حقوقِ طلبی کے لیے جب کانگریس قائم ہوئی تو سب سے پہلے حضرت قطب وقت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ سرپرست ثانی دارالعلوم دیوبند نے اس میں شرکت کا فتویٰ دیا۔

برطانیہ کی سازش سے خلافتِ ترکی پر زوال آیا تو علمائے دیوبند باوجود اپنی تدریسی مشاغل کے پوری ہمت و پامردی کے ساتھ احتجاج اور اس کے جلسوں کے لیے کھڑے ہوگئے۔ ریشمی رومال کی تاریخ سے کون ناواقف ہے۔ جس کے بانی حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب صدر المدرسین دارالعلوم الدیوبند قدس سرہ تھے، جنھوں نے اس سلسلے میں مالٹا کی قید و بند کے مصائب پانچ برس تک جھیلے۔

آزادی وطن کی تحریک اٹھی تو انھی علمائے دیوبند نے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ کی قیادت میں جمعیۃ العلماء ہند قائم کر کے شانہ بشانہ جنگِ آزادی لڑی اور حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند نے باوجود مشاغل تدریس دارالعلوم کے برسہا برس اس کی قیادت کی اور ملک کو آزاد کرایا۔

مسلم لیگ نے پاکستان کی تحریک اٹھائی اور ایک بڑے طبقہ علماء نے ابتداء اس کی مخالفت کی، لیکن یہ محسوس کر کے کہ پاکستان بن جانا یقینی ہے اور ممکن ہے کہ وہ اسلامی آئین کا خطہ ثابت ہو، حضرت مولانا تھانوی قدس سرہ اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ اس کی قیادت بھی کی تا کہ پاکستان میں دینی آواز پست ہونے نہ پائے۔ ہندوستان کو آزادی مل جانے کے بعد مسلمانوں کے حقوق کی نگرانی و حفاظت میں جمعیۃ العلماء ہند نے جو جدوجہد کی اسے تاریخ فراموش نہیں کرسکتی۔ (علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج: ص۱۷۴، ۱۷۵)

قائداعظم کی مجلس میں ایک دفعہ یہ گفتگو آئی کہ کانگریس میں علماء زیادہ ہیں اور مسلم لیگ میں علماء کوئی نہیں، جس کی وجہ سے مسلمانوں کو مسلم لیگ سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ یہ سن کر قائداعظم نے جوش کے لہجہ میں فرمایا کہ مسلم لیگ کے ساتھ ایک بہت بڑا عالم ہے جس کا علم و تقدس و تقویٰ اگر ایک پلڑے میں رکھا جائے اور تمام علماء کا علم و تقدس و تقویٰ دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو اس کا پلڑا بھاری ہوگا۔ وہ مولانا اشرف علی تھانوی ہیں جو چھوٹے سے قصبے میں رہتے ہیں۔ مسلم لیگ کو ان کی حمایت کافی ہے، اور کوئی موافقت کرے یا نہ کرے ہمیں پرواہ نہیں۔ (تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی: ص۷۸، ۷۹ ملخصاً منشی عبدالرحمٰن خان، ادارہ اسلامیات، لاہور، ط: ۱۹۹۲م، یہ کتاب اپنے موضوع پر بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ نیز دیکھیے: قائداعظم کا مذہب اور عقیدہ: منشی عبدالرحمٰن خان، کاروان ادب، ملتان، ط: اول: ۱۹۸۶م)

مولانا عبدالماجد دریا آبادی لکھتے ہیں: ۱۹۲۸م میں جب پہلی بار (حضرت تھانوی کی خدمت میں)

حاضری ہوئی تو حضرت نے دار السلام کی اسکیم خاصی تفصیل سے بیان فرمائی تھی۔ پاکستان کا تخیل، خالص اسلامی حکومت کا خیال، یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں۔ پہلے پہل اس قسم کی آوازیں یہیں کان میں پڑیں۔ حضرت کی گفتگو میں یہ جز بالکل صاف تھا۔ (ماہنامہ الحسن: حضرت تھانوی نمبر: ۱/ ۱۰۷، صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ/ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۸۷ء، جامعہ اشرفیہ، لاہور) اس کے اڑھائی سال بعد اقبال مرحوم نے اپنے خطبہ الہ آباد میں پاکستان کا مطالبہ پیش کیا۔ (مصدر سابق: ۱/ ۱۰۷، پاکستان کا ابتدائی پانچ نکاتی خاکہ: منشی عبدالرحمٰن خان)

۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء کو ملک کی سب سے بڑی مقتدر ہستی یعنی قائد اعظم محمد علی جناح گورنر جنرل پاکستان نے علمائے ربانی کی تاریخی خدمات کے اعتراف کے طور پر پاکستان کی پرچم کشائی کا اعزاز علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ کو بخشا۔ جنھوں نے اپنے متبرک ہاتھوں سے آزاد پاکستان کا آزاد فضا میں پرچم لہرا کر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کو اسلامی ممالک کی برادری میں شامل کرنے کی رسم کا افتتاح کیا، اور دنیا نے دیکھ لیا کہ مجدد الملت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کا جو نقشہ جون ۱۹۲۸ء کو پیش کیا تھا، اس کی رسم افتتاح بھی دربار اشرفیہ کے خدام کے حصہ میں آئی۔

(تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی: ص ۲۷۲، ملخصا)

پاکستان بننے کے بعد ایک صاحب نے مجلس میں (حضرت مدنی سے) پوچھا کہ حضرت پاکستان کے بارے میں کیا خیال ہے؟ تو حسب معمول سنجیدگی اور بشاشت سے فرمایا: مسجد جب تک نہ بنے اختلاف کیا جاسکتا ہے، لیکن جب وہ بن گئی تو مسجد ہے۔ (حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے حیرت انگیز واقعات: ص ۱۷۸، مولانا ابوالحسن بارہ بنکوی، مکتبۃ الحسن، لاہور، ط: ۱۴۳۰ھ/ ۲۰۰۹ء)

حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میری آخری رائے اب یہی ہے کہ ہر مسلمان کو پاکستان کی فلاح و بہبود کی راہیں سوچنی چاہئیں، اور اس کے لیے عملی اقدام اٹھانا چاہیے۔ مجلس احرار کو ہر نیک کام میں حکومت پاکستان کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے اور خلاف شرع کام سے اجتناب۔ اصلاح احوال کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر **الدین النصیحۃ** پر عمل ہونا چاہیے۔

(حیات امیر شریعت: ص ۳۱۲، جانباز مرزا، چٹان پریس، لاہور، ط: ۱۹۷۰ء، اور دیکھیے: ص ۳۱۱- ۳۲۷)

**۱۰: استغناء اور توکل**

حضرت نانوتویؒ نے دار العلوم دیوبند کے آٹھ بنیادی اصول تحریر فرمائے۔ اور حضرت مولانا شاہ رفیع الدینؒ نے آٹھ انتظامی اصول تحریر فرمائے۔ آٹھ بنیادی اصولوں میں سے آخری تین اصول ملاحظہ ہوں:

۶: اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں تب تک یہ مدرسہ ان شاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی

طرح چلے گا۔اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا۔اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی۔ اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا۔القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی رہے۔

۷: سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

۸: تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندے سے امید ناموری نہ ہو۔بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔(تاریخ دار العلوم دیوبند: ص ۱۴۔۱۷ ملخصا)

مولانا محمد علی جوہر جب تحریک خلافت کے موقع پر دیوبند تشریف لائے، دار العلوم میں پہنچے اور یہ اصول ہشتگانہ حضرت (نانوتوی) ہی کے قلم سے لکھے ہوئے ان کے سامنے پیش کیے گئے تو مولانا کی آنکھوں میں آنسو آگئے، اور فرمایا: ان اصولوں کا عقل سے کیا تعلق؟ یہ تو خزانہ غیب اور مخزن معرفت سے نکلے ہوئے ہیں۔حیرت ہے کہ جن نتائج تک ہم سو برس میں دھکے کھا کر پہنچے ہیں، یہ بزرگ سو برس پہلے ہی ان نتائج تک پہنچ چکے تھے۔

(ماہنامہ الرشید: ص ۱۳۸)

نواب کلب علی خان نے اپنے خاص سیکرٹری کو اور وزیر عثمان کو حضرت (نانوتوی) کی خدمت میں بھیجا کہ میں حضرت کا مشتاق ہوں، مجھ سے مل لیں۔حضرت نے اول تو اعذار شروع کیے کہ میں غریب ہوں دیہات کا رہنے والا ہوں، آداب امراء سے غیر واقف ہوں۔لیکن وزیر نے اپنی شستہ اور سجل تقریر میں عرض کیا کہ حضرت نواب صاحب تو خود حضرت کا ادب کریں گے۔حضرت تمام آداب سے مستثنیٰ رہیں گے۔تب آخر میں مولانا نے ارشاد فرمایا کہ پھر نواب صاحب ہی تو میری ملاقات کے مشتاق ہیں۔میں تو ان کی زیارت کا مشتاق نہیں ہوں۔اگر ان کو اشتیاق ہے تو خود مجھ سے ملنے آئیں، ان کے پیروں میں مہندی تو نہیں لگی ہے۔بہر حال نہ جانا تھا نہ گئے۔اور امراء کے مقابلہ میں حضرت کا یہی طرز عمل رہا ہے۔نواب محمود علی خان صاحب رئیس چھتاری ساری عمر اسی تمنا میں رہے کہ کسی طرح مل لوں، مگر حضرت نے اتنا موقع ہی نہ دیا۔اگر حضرت کے علی گڑھ آنے کی خبر سن کر وہ علی گڑھ آئے تو حضرت جھٹ سے خورجہ تشریف لے گئے۔جو خورجہ گئے تو حضرت میرٹھ آگئے۔اسی طرح بغیر نواب صاحب کی درخواست مانے ہوئے رامپور واپس تشریف لے آئے۔(ارواح ثلاثہ: ص ۲۲۸، ۲۲۹) حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی نواب حیدر آباد دکن سے ملاقات کا دلچسپ واقعہ دیکھیے: ملفوظات حکیم الامت: ۵/۲۷۲-۲۷۵، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ط: ۱۴۲۹ھ)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: علماء اور مشائخ کو چاہیے کہ وہ ایسا طرز نہ اختیار کریں کہ جس سے اہل دین اور دین کی بے وقعتی لوگوں کی نظروں میں پیدا ہو۔اور زیادہ تر اہل مدارس کی بدولت عوام خراب ہوئے ہیں۔اہل مدارس مدرسوں کی وجہ سے زیادہ چاپلوسی کرتے ہیں۔سمجھتے ہیں کہ اگر ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا تو یہ چندہ نہ

دیں گے۔ میں کہتا ہوں یہ خیال ہی غلط ہے کہ چندہ نہ دیں گے۔ دیں گے، ضرور دیں گے۔ اس لیے کہ یہ تو حق تعالی کے قبضہ میں ہے۔ اگر خلوص ہے پھر فلوس تو تمھارے جوتوں سے لپٹتے پھریں گے۔ اور اگر دے ہی دیا مگر تم کو اور دین کو بے وقعتی کی نظر سے دیکھا تو ایسے چندوں کو لے کر کیا کرو گے؟ کیونکہ جو مقصود تھا مدارس کا کہ دین اور اہل دین کی قلوب میں عظمت ہو، وقعت ہو، تبلیغ کا اثر ہو، جب وہ حاصل نہ ہوا تو مدارس ہی کو لے کر کیا چاٹو گے؟ مجھ کو تو ہمیشہ اس کا خیال رہتا ہے کہ دین کی اور اہل دین کی بے عظمتی اور بے وقعتی نہ ہو، اور یہ کہ ہمیشہ مصالح دنیوی پر مصالح دینی مقدم رہیں۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۶/۱۴۶، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ط: ۱۴۲۹ھ) اور فرماتے ہیں: غرض نہ تکبر ہو، نہ تذلل ہو۔ اور یہ اعتدال پیدا ہوسکتا ہے کسی کامل کی صحبت سے۔ اس کی جوتیاں سیدھی کرنے سے۔ بلکہ اور ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جوتیاں کھانے سے۔ اور یہ بھی بتلائے دیتا ہوں کہ وہ جوتیاں مارے گا نہیں، مگر تم کو اس کے لیے تیار ہو کر آنا چاہیے۔ (مصدر سابق: ۶/۱۶۱)

۱۱: متفرق تعلیمی خصوصیات

(الف) کتاب وار نظام تعلیم:

مدارس عربیہ اور بالخصوص دارالعلوم کے نظام تعلیم میں ایک خصوصیت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ یہ کہ جماعت وار نظام تعلیم یعنی درجہ بندی جو عام طور پر علمی درس گاہوں اور یونیورسٹیوں میں رائج ہے اس کے بجائے کتاب وار نظام تعلیم اختیار کیا گیا ہے۔ یعنی ہمارے مدارس میں جماعت بندی (کلاس سسٹم) نہیں ہے، بلکہ طلبا کو تعلیمی لحاظ سے کتابوں پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ اگر یہ بتلانا ہو کہ طالب علم تعلیمی استعداد کے لحاظ سے کس دور سے گزر رہا ہے تو جماعت کا نام لینے کے بجائے یہ کہا جائے گا کہ فلاں فلاں کتاب پڑھ چکا ہے۔ سالانہ تعلیمی ترقی میں بھی درجات کے بجائے کتابوں کا ہی لحاظ رکھا جاتا ہے۔ سالانہ امتحان میں اگر طالب علم ایک یا دو کتابوں میں فیل ہو جاتا ہے، اور بقیہ میں پاس ہو جاتا ہے، تو وہ کتابیں جن میں طالب علم فیل ہوا ہے ان کتابوں کی سالانہ ترقی میں حارج نہیں ہوتیں جن میں اس نے کامیابی حاصل کر لی ہو۔ جن کتابوں میں طالب علم ناکام ہوتا ہے سال آئندہ میں انھی کتابوں کا اعادہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ ایک یا دو کتابوں کی ناکامی کے باعث کامیاب شدہ کتابوں کے اعادے پر مجبور کیا جائے۔ اس کا نتیجہ جہاں ایک طرف یہ نکلتا ہے کہ طالب علم میں بددلی پیدا ہونے نہیں پاتی، وہیں دوسری جانب اس کی مدت اور مصارف تعلیم میں بھی فی الجملہ وقت اور روپے کی کفایت ہو جاتی ہے۔ (ماہنامہ الرشید: ص ۱۸۹)

(ب) طریق درس:

دارالعلوم میں لیکچروں کے بجائے تعلیم کا یہ طریقہ رائج ہے کہ استاد اور شاگرد دونوں کے سامنے کتاب ہوتی ہے۔ استاد کا فرض ہے کہ جب طالب علم سبق کی عبارت پڑھ چکے تو استاد فنی حیثیت سے اس پر ایک جامع تقریر کرے

جس میں متعلقہ مسائل کے ہر پہلو پر روشنی ڈالے اور آخر میں اپنی تقریر کو کتاب کی عبارت پر منطبق کر کے طالب علم کو مطمئن کر دے۔ طلباء درس میں بالکل آزاد ہوتے ہیں اور وہ اس کے مستحق ہوتے ہیں کہ جب تک سبق کو پوری طرح سمجھ نہ لیں، اور جتنے اعتراضات اس سبق کے بارے میں ہوں ان کا تسلی بخش جواب استاد سے نہ سن لیں اسے آگے نہ بڑھنے دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف طالب علم مطالعہ کر کے اور پوری تیاری کر کے درس میں آکر بیٹھتے ہیں اور دوسری طرف استاد بھی پوری محنت اور تیاری کے ساتھ پڑھانے پر مجبور ہوتا ہے۔ موجودہ طریق تعلیم کے مطابق دارالعلوم میں یہ طریقہ رائج نہیں ہے کہ استاد آئے مضمون پر لیکچر دے دے اور طلباء لیکچر نوٹ کر لیں۔

(مصدر سابق: ص ۱۹۰)

(ج) امتحان:

دارلعلوم میں امتحان کے سلسلے میں جو قواعد مروج ہیں وہ فی الجملہ یونیورسٹیوں کے امتحانات سے زیادہ سخت ہیں۔ دارلعلوم کے امتحان میں ہر کتاب کے متعلق تین سوال ہوتے ہیں اور ہر پرچے میں تینوں کا حل اس لیے لازم ہوتا ہے کہ تینوں کے نمبر مشترکہ ہوتے ہیں۔ اگر ایک سوال بھی چھوڑ دیا جائے تو طالب علم فیل ہو جاتا ہے۔ کامیابی کے نمبروں کا معیار ۸۰ / فیصد رکھا گیا ہے جو یونیورسٹیوں کے ۳۳ / فیصد سے کہیں زیادہ ہے۔

(مصدر سابق: ص ۱۹۱)

(د) مادری زبان میں تعلیم:

دارلعلوم (دیوبند) کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہاں درس و تعلیم کی زبان اُردو قرار دی گئی ہے۔ کتابیں عربی زبان میں ہیں مگر اساتذہ کی تقریریں اردو میں ہوتی ہیں۔ علوم وفنون کی تعلیم میں جو اہمیت مادری زبان کو حاصل ہے، اس کو یونیورسٹی کے نظام تعلیم میں بڑی مدت کے بعد سمجھا جا سکا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ علمی مسائل جس آسانی سے مادری زبان میں سمجھ آتے ہیں اور حافظہ میں محفوظ رہتے ہیں، وہ دوسری زبان میں ممکن نہیں ہیں۔ مگر انگریزی اقتدار کے غلبے نے قوم کے دماغوں کو اس قدر متاثر اور مغلوب کر دیا تھا کہ وہ عرصے تک اس حقیقت کا سراغ نہ پا سکی۔ (مصدر سابق: ص ۱۹۱، ۱۹۲)

(ہ): خالص دینی تعلیم:

حضرت تھانوی قدس سرہ ایک مثالی دینی مدرسے کی خصوصیات کے بارے میں فرماتے ہیں: وہ خالص مذہبی مدرسہ ہو، یعنی دنیا کا نہ اس میں غلبہ ہو، نہ خلط ہو۔ کیونکہ اگر غلبہ ہے تو احکام و آثار میں حکما و وقوعا اعتبار غالب کا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ دنیوی مدرسہ ہوگا اور گفتگو ہے مذہبی دارالعلوم میں۔ اس لیے دنیوی مدرسہ مذہبی دارالعلوم نہیں ہوسکتا۔ اور اگر دنیا کا خلط ہے تو تجربہ سے طے ہو چکا ہے کہ دنیا بوجہ عاجل ہونے کے نفوس کو جلدی اپنی طرف مائل

کرتی ہے، تو دنیا و دین کا جامع بنانا مآل کار دنیا دار بنانا ہے، تو ایسا مدرسہ بھی دنیوی مدرسہ ہوگا جو مذہبی دار العلوم نہیں بن سکتا۔ دوسری غرض دار العلوم سے خادمان مذہب کا پیدا کرنا ہے اور خدمت مذہب کے لیے صرف تحصیل علوم ہی کافی نہیں، بلکہ اس کے لیے سخت ضرورت ہے تقدس و تعشق دین و خلوص و للّٰہیت و توکل و قناعت و تواضع و انکسار و تحمل مشاق و مصائب کی۔ اور خلط دنیا کے ساتھ یقینی اور مشاہد ہے کہ یہ صفات پیدا نہیں ہوسکتیں۔ نیز ان صفات کے پیدا ہونے میں ان اوصاف والوں کی صحبت طویلہ کو، اور صحبت بھی بلا شرکت ان کے اضداد کے، بڑا دخل ہے۔ اور خلط کی صورت میں یا تو ایسی صحبت ہی میسر نہ ہوگی، یا اگر ہوئی تو بوجہ خلط دنیا کے ان کے اضداد کی معیت ان آثار کو ضعیف کرتی رہے گی۔ غرض ایسی جگہ کی آب و ہوا دینی و مذہبی نہیں ہوسکتی۔ اور بدوں اس کے یہ اوصاف نہیں پیدا ہوسکتے، اور بدوں ان اوصاف کے کوئی خادم دین بن نہیں سکتا، تو ایسے مخلوط مدرسہ سے خدام دین نہیں پیدا ہوسکتے، اس لیے وہ دار العلوم بھی نہیں بن سکتا۔

(خطبات حکیم الامت: ۳۰/۵۲، ۵۳، ت: صوفی اقبال، مولانا زاہد محمود، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ط: ۱۴۲۸ھ)

اور فرماتے ہیں: اور میں تو آج کل اس (دستکاری کی تعلیم کو طلبہ کے لیے) بہت ہی ضروری سمجھتا ہوں، کیونکہ ایسا شخص جو کسی قسم کا پیشہ اور ہنر جانتا ہو مخلوق کو دھوکہ دے کے دنیا نہ کمائے گا۔ جیسا آج کل بہت لوگوں نے پیرزادگی کا جال پھیلا رکھا ہے۔ اور بہت سے نااہلوں نے وعظ گوئی کو ذریعہ معاش بنالیا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ دینی مدارس میں دستکاری کی شاخ کھول دی جائے، کیونکہ ہر کام کا ایک اُصول ہوتا ہے۔ بے اصول کوئی کام سرسبز نہیں ہوتا۔ پس دستکاری کی تعلیم کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ اس کو دینی تعلیم کے ساتھ منضم کیا جائے۔ کیونکہ پھر دونوں کے مدغم ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ اول اول انضمام ہوتا ہے، پھر انجام کار ادغام ہوجاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دینی تعلیم کا نام ہی نام رہ جاتا ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کو جہاں دستکاری کی ضرورت ہے وہاں اس سے زیادہ اس کی ضرورت ہے کہ ان میں ایسے افراد پیدا ہوں جو علوم دین میں متبحر ہوں۔ اور تجربہ ہے کہ دینی تعلیم میں تبحر اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ طالب علم تعلیم دین کے وقت ہمہ تن اسی طرف متوجہ ہوں، اور دستکاری کی شاخ مل جانے کے بعد توجہ منقسم ہوجائے گی۔ اس لیے دین میں تبحر حاصل نہ ہوسکے گا۔ اسی لیے میں اس کا بھی مخالف ہوں کہ دینی مدارس میں تقریر و مناظرہ کے لیے کوئی شعبہ قائم کیا جائے۔ کیونکہ تجربہ ہے کہ طالب علم تقریر و مناظرہ میں زمان تعلیم کے وقت مشغول ہوکر پھر کتابوں میں پوری توجہ نہیں کرتے جس سے ان کی کتابی استعداد ناقص رہ جاتی ہے۔

بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ان کاموں کے لیے مستقل مدارس قائم کیے جائیں۔ دینی مدارس میں محض مسائل دین اور ان کے مقدمات کی تعلیم ہونی چاہیے۔ اور دستکاری کے مدرسوں میں محض دستکاری کی تعلیم ہونی چاہیے۔ اور مناظرہ کے مدارس میں محض مناظرہ کی تعلیم ہونی چاہیے۔ اس طرح جو شخص جس مدرسہ سے فارغ ہوگا وہ

اس کام میں ذی استعداد اور فاضل ہوگا۔ (مصدر سابق: ۳۰/ ۳۴۵، ۳۴۶)

اس سے واضح ہوا کہ دینی مدارس میں دینی علوم اور عصری فنون کے امتزاج کا انجام کیا ہوتا ہے؟ اور طلبہ کو عصری فنون سکھانے کی صحیح صورت کیا ہے؟ اگر بالفرض پہلے کسی دور میں یہ امتزاج کامیاب رہا بھی ہو، تب بھی یہ اجتماع موجودہ دور کے زمینی حقائق اور معروضی حالات سے میل نہیں کھاتا۔

اس بارے میں اکابرین دیوبند کے اصل موقف کی مزید تصریحات کے لیے ملاحظہ فرمائیں:

۱: سوانح قاسمی: ۲/ ۲۷۶-۲۸۷، مولانا مناظر احسن گیلانی، دار العلوم دیوبند

۲: احسن التفہیم لمسئلۃ التعلیم: حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی، دار النعیم، مکتبہ سید احمد شہید، لاہور، سنہ ندارد

۳: نصاب ونظام دینی مدارس: ص ۱۳۱-۱۵۴، حضرت مفتی جمیل احمد تھانوی، ناشران قرآن لمیٹڈ، اردو بازار لاہور، سنہ ندارد

۴: ماہنامہ بینات: حضرت بنوری نمبر: ص ۲۲۷-۲۳۱، جامعۃ العلوم الاسلامیہ، بنوری ٹاؤن، کراچی، محرم تا ربیع الاول ۱۳۹۸ھ/ جنوری، فروری ۱۹۷۸م

۵: معارف شیخ الحدیث (مولانا محمد زکریا): ص ۱۸۲-۱۸۵، مرتب: حافظ محمد اکبر شاہ، زمزم پبلشرز، کراچی، ط: ۲۰۰۷م

۶: الہدایات المفیدۃ: حضرت مفتی رشید احمد لدھیانوی، احسن الفتاوی: ۱/ ۴۲۵-۴۲۸، ایچ ایم سعید، کراچی، ط: ۱۴۲۵ھ

۷: دینی مدارس میں دنیوی تعلیم: مفتی ابولبابہ شاہ منصور، ماہنامہ وفاق المدارس، ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ، ص ۲۳-۳۱

(و): بقدر ضرورت معقولات کی تعلیم:

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں (ترجمہ): علم منقول غذا کی طرح مقصود ہے۔ اور علم معقول دوا کی طرح ضروری ہے، اس کے لیے جو منقول کی فرض کفایہ مقدار حاصل کرنے لگے اور اس کا ذہن دلیل میں معقول کے بغیر غلطی سے نہ بچ سکے۔ ضروری چونکہ بقدر ضرورت ہوتا ہے، اور اس کی مقدار ذہنوں کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ تو جتنی مقدار سے ضرورت پوری ہو جائے بس اتنی مقدار ضروری ہوگی۔ اور جسے ضرورت بھی نہ ہو اور نقصان بھی نہ ہو اس کے لیے معقولات سیکھنا مباح ہے۔ اور جسے نقصان ہو اس کے لیے مذموم ہے۔ اور جتنا نقصان ہو اسی کے لحاظ سے کراہت اور حرمت ہوگی۔ (امداد الفتاوی: ۴/ ۷۷، مکتبہ دار العلوم کراچی، ط: ۱۴۳۱ھ)

اور فرمایا: اگر علم دین کے ساتھ معقول کو اس غرض سے پڑھا جائے کہ اس سے فہم واستدلال میں سہولت ہو جاتی ہے تو اس وقت اس کا وہی حکم ہے جو نحو وصرف وبلاغت وغیرہ کا حکم ہے، کہ یہ سب علوم آلیہ ہیں، اگر ان سے علم دین میں مدد لی جائے تو تبعاً ان سے بھی ثواب مل جاتا ہے۔ (تحفۃ العلماء: ۱/ ۵۱۲، ۵۱۳، ت: مفتی محمد زید، مکتبہ سید احمد

شہید، اکوڑہ خٹک، سن ندارد)

جب کبھی آپ (حضرت مفتی محمد شفیع) کے سامنے یہ تجویز پیش ہوتی کہ معقولات کو درس نظامی سے نکال دیا جائے تو حضرت والد صاحب اس کی سخت مخالفت فرماتے تھے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ اور عقائد پر لکھی ہوئی متقدمین کی کتابیں معقولات کی اصطلاحوں سے بھری ہوئی ہیں۔ اور اگر قدیم منطق وفلسفہ کو بالکل دیس نکالا دے دیا جائے تو اسلاف کی ان کتابوں سے خاطر خواہ استفادے کی راہ مسدود ہو جاتی ہے۔ جو ہمارا گرانقدر علمی سرمایہ ہیں۔ اس کے علاوہ منطق وفلسفہ کی تعلیم سے ذہن کو جلا ملتی ہے اور ذہن مسائل کو مرتب طریقے سے سوچنے کا عادی بن جاتا ہے اور اس طرح یہ علوم تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول فقہ کے مسائل سمجھنے میں معاون ہوتے ہیں۔

حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اگر ان علوم کی اصل حقیقت کو ذہن نشین کر کے کوئی شخص اس نیت سے ان علوم کو پڑھے پڑھائے کہ ان سے دینی علوم کی تحصیل میں مدد ملے گی تو ان علوم کی تحصیل بھی عبادت بن جائے گی۔ اور درس نظامی کے مرتبین نے اسی وجہ سے ان کو داخل درس کیا تھا۔ اور حضرت شیخ الہند فرمایا کرتے تھے کہ اگر نیت بخیر ہو تو ہمارے نزدیک بخاری پڑھانے والے اور قطبی پڑھانے والے میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ خدمت انجام دے رہے ہیں اور دونوں کی خدمت موجب اجر وثواب ہے۔ (البلاغ: حضرت مفتی محمد شفیع نمبر: ۱/ ۳۵۸، مکتبہ دار العلو کراچی، ط: ۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۵م) معقولات کو نصاب سے بالکل خارج کرنے کا انجام: دیکھیے: جہان دیدہ: ص ۲۲، ۲۳، مکتبہ معارف القرآن، کراچی، ط: ۱۴۳۱ھ)

۱۲: ختامہ مسک

حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: غرض علم واخلاق، خلوت وجلوت اور مجاہدہ وجہاد کے مخلوط جذبات ودواعی سے ہر دائرہ دین میں اعتدال اور میانہ روی ان (علمائے دیوبند) کے مسلک کی امتیازی شان بن گئی۔ جو علوم کی جامعیت اور اخلاق کے اعتدال کا قدرتی ثمرہ ہے۔ اسی لیے ان کے محدث ہونے کے معنی فقیہ سے لڑنے یا فقیہ ہونے کے معنی محدث بیزار ہو جانے یا نسبت احسانی (تصوف پسندی) کے معنی متکلم دشمنی یا علم الکلام کی حذاقت کے معنی تصوف بیزاری کے نہیں، بلکہ اس جامع مسلک کے تحت اس تعلیم گاہ کا فاضل درجہ بدرجہ بیک وقت محدث، فقیہ، مفسر، مفتی، متکلم، صوفی (محسن) اور حکیم ومربی ثابت ہوا۔ اس مسلک کی جامعیت کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ جامع علم ومعرفت، جامع عقل وعشق، جامع عمل واخلاق، جامع مجاہدہ وجہاد، جامع دیانت وسیاست، جامع روایت ودرایت، جامع خلوت وجلوت، جامع عبادت ومدنیت، جامع حکم وحکمت، جامع ظاہر وباطن اور جامع حال وقال ہے۔ اس مسلک کو جو سلف وخلف کی نسبتوں سے حاصل شدہ ہے، اگر اصطلاحی الفاظ میں لایا جائے تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دار العلوم دیوبند دیناً مسلم، فرقۃً اہل سنت والجماعت، مذہباً حنفی، مشرباً صوفی، کلاماً اشعری، سلوکاً

چشتی، بلکہ جامع سلاسل، فکراً ولی اللّٰہی، اصولاً قاسمی، فروعاً رشیدی اور نسبتاً دیوبندی ہے۔

(تاریخ دارالعلوم دیوبند: ص۲۳، ۲۵/ملخصا)

حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ نے جمعرات ۳۰/نومبر ۱۹۴۰ء کی شب دارالحدیث دارالعلوم دیوبند میں طلبائے دارالعلوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: آپ حضرات کو ابھی اس نعمت خداوندی کی قدر نہیں ہے کہ اس نے آپ کا تعلیمی رشتہ دارالعلوم دیوبند سے منسلک کر دیا ہے۔ جب اس بسم اللہ کے گنبد سے آپ باہر نکلیں گے اور کتاب و سنت اور فقہی مسائل کی تعبیر میں آپ کو افراط و تفریط کا ایک بھیانک منظر نظر آئے گا، اس وقت معلوم ہوگا کہ دیوبند اور اس کا معتدل مسلک کیسی عظیم نعمت ہے۔

میں بھی طالب علمی کے زمانے میں آپ کی طرح محض اپنے والد مرحوم کے حکم کی تعمیل میں دارالعلوم سے متعلق ہوا، یہاں کے اساتذہ سے اپنے حوصلہ کے مطابق علم حاصل کیا اور مسلک دیوبند تقلیداً اختیار کیا، لیکن دنیا کے نشیب و فراز اور سرد و گرم دیکھنے، فرقہ وارانہ مباحث سے گزرنے کے بعد اپنی تحقیق سے اس مسلک کے اعتدال کی خوبیاں مستحضر ہوئیں۔ وطن کے اعتبار سے تو میں دیوبندی فطرتاً تھا۔ اور مسلک کے اعتبار سے تقلیداً۔ لیکن طویل غور و فکر بحث و تمحیص کے بعد مسلک دیوبند کے اتباع کا محض تقلید سے نہیں، بلکہ بصیرت سے پابند ہوں۔

(ماہنامہ الرشید: ص۱۵۷)

مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ نے دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کے موقع پر اپنی تقریر میں فرمایا تھا: اس درسگاہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اختلافی مسائل کے بجائے توحید و سنت پر اپنی توجہ مرکوز کی اور یہ وہ وراثت اور امانت ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید کے وسیلہ سے اس کو ملی اور ابھی تک اسکو عزیز ہے۔ دوسری خصوصیت اتباع سنت کا جذبہ اور فکر ہے۔ تیسری خصوصیت تعلق مع اللہ کی فکر اور ذکر و حضوری اور ایمان و احتساب کا جذبہ ہے۔ چوتھا عنصر ہے اعلائے کلمۃ اللہ کا جذبہ اور کوشش اور دینی حمیت و غیرت۔ یہ چار عناصر مل جائیں تو دیوبندی بنتا ہے، اگر ان میں سے کوئی عنصر کم ہو جائے تو دیوبندیت ناقص ہے۔ فضلائے دارالعلوم دیوبند کا یہی شعار رہا ہے، اور وہ ان چاروں چیزوں کے جامع رہے ہیں۔

(کاروان زندگی: آپ بیتی مولانا ابوالحسن علی ندوی، ۲/۳۱۰، ۳۱۱، مکتبہ اسلام لکھنؤ، ط: ۱۴۲۶ھ/۲۰۰۵م)

خلاصہ یہ کہ مدرسہ دیوبند اہل السنۃ والجماعۃ کے منقول و متوارث مذہب کی علمی و عملی ہر دو طرح جامع، معتدل اور صحیح ترجمانی ہی کا نام ہے۔

اسلام زندہ باد☆ دیوبند پائندہ باد ایں دعا از من و جملہ جہاں آمین باد

☆......☆......☆......☆

مولانا مجیب الرحمٰن، ڈیرہ اسماعیل خان قسط:۶

# غامدی صاحب کے مزعومہ اجتہادات پر ایک نظر

## امام بزدوی رحمہ اللہ کا حوالہ:

غامدی صاحب اس بارے میں لکھتے ہیں:

''کسی کلام کے وجود میں آنے کے بعد جو تغیر بھی اُس کلام کی طرف منسوب کیا جائے گا آپ اُسے نسخ کہیے یا تغیر وتبدل، اُسے تبیین یا بیان یا شرح قرار نہیں دیا جاسکتا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ علماء اصول میں سے جن لوگوں کی نگاہ لفظ کی اِس حقیقت پر رہی ہے، انہوں نے تبیین کی تعریف میں یہ بات پوری طرح واضح کردی ہے، امام بزدوی علم اصول پر اپنی کتاب میں فرماتے ہیں: **حد البیان مایظھر به ابتداء وجوده فاما التغیر بعد الوجود فنسخ ولیس ببیان.** [**کنز الوصول، البزدوی: ۲۱۲**]

بیان کا اطلاق اُس شے پر کیا جاتا ہے جس کے ذریعے سے اُس شے کا ابتداء ہی سے کلام میں موجود ہونا ظاہر ہوجاتا ہے، رہا وہ تغیر جو کلام کے وجود میں آنے کے بعد کیا جائے تو وہ نسخ ہے، اُسے بیان قرار نہیں دیا جاسکتا۔'' [برہان: ۴۶]

## جواب:

غامدی صاحب کی بیان کی ہوئی عبارت پر علامہ عبد العزیز بن احمد بخاری (م ۷۳۰ھ) فرماتے ہیں:

**وھٰذا الکلام انّما یستقیم علی اختیار القاضی الامام وشمس الائمة رحمهما الله فانّما لم یجعلا النسخ من اقسام البیان، فاما علی اختیار الشیخ رحمه الله فلا یستقیم لانّه جعل النسخ احد اقسام البیان وسماه بیان التبدیل ثم قال ھاھنا انه لیس ببیان، ووجه التوفیق انه انما جعل النسخ من اقسام البیان باعتبار انه [مِن] عند الله بیان انتهاء مدة الحکم، ولم یجعله بیانا ھاھنا باعتبار الظاھر فانه فی الظاھر رفع لحکم الثابت وابطاله فلا یکون بیانا له.** [**کشف الاسرار شرح أصول البزدوی: ۱۱۹/۳**]

یہ گفتگو قاضی امام اور شمس الائمہ رحمہما اللہ کے اختیار کیے ہوئے پہلو پر تو درست ہے کہ انہوں نے نسخ کو بیان کے اقسام میں سے نہیں بنایا، لیکن شیخ بزدوی رحمہ اللہ کے نزدیک مختار پہلو کے مطابق درست نہیں ہے، کیوں کہ شیخ بزدوی رحمہ اللہ نے نسخ کو بیان کی ایک قسم بنا کر اُس کو بیانِ تبدیل کا نام دیا ہے، اور اَب یہاں کہا ہے کہ نسخ بیان نہیں ہے (تو تعارض ہے) تطبیق کی صورت یہ ہے کہ اُنہوں نے نسخ کو بیان کے اقسام

سے بنایا اِس اعتبار سے کہ نسخ اللہ تعالی کے پاس سے حکم کی مدت ختم ہونے کا بیان ہے، اور نسخ کو جو بیان نہیں ٹھہرایا تو وہ ظاہر کے اعتبار سے، کیوں کہ نسخ ظاہر میں ثابت حکم کو اٹھانا اور ختم کرنا ہے، اس لئے وہ حکم کا بیان نہیں بنتا۔

اِس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب نے امام بزدوی کی بات اُدھوری لی ہے، پوری بات یوں ہے کہ اُن کے نزدیک ظاہر کے اعتبار سے نسخ بیان نہیں ہے، لیکن حقیقت کے لحاظ سے نسخ بھی بیان ہے، اس طرح کہ نسخ اللہ تعالی کی طرف سے بیان ہے کہ جو حکم پہلے دیا گیا تھا اُس پر عمل کرنے کی مدت ختم ہو چکی ہے، اس لئے اب عمل نہ کرو، تو امام بزدوی رحمہ اللہ کی عبارت اپنی تائید میں پیش کرنا بالکل غلط ہے۔

**آیاتِ قرآنی سے استدلال کہ سنت قرآن کا حکم منسوخ نہیں کرسکتی:**

**اور جواب:**

جہاں تک قرآن مجید کی وہ آیات ہیں جن میں ہے کہ قرآن مجید کی باتوں میں تبدیلی نہیں ہوسکتی، نبی کریم ﷺ اِس کو تبدیل نہیں کر سکتے مثلاً: **لَامُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ ، قُلْ مَايَكُوْنُ لِيْ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِيْ.**

تو اِن آیات کا بھی صحیح محمل نکل سکتا ہے، مثلاً:

(۱) نبی کریم ﷺ بذاتِ خود نہیں تغیر کر سکتے، جو تغیر معلوم ہوتا ہے وہ خود اللہ تعالی فرماتے ہیں، حدیث میں محض بزبانِ نبی اُس کا بیان ہوتا ہے جیسا کہ ابھی ذکر ہوا۔

(۲) جس چیز کو واقعی تبدیلی کہتے ہیں وہ نبی یا امتی کوئی نہیں کرسکتا کہ قرآن مجید کا مضمون ہی بدل دیں یعنی اللہ تعالی نے کسی کام کے کرنے کا حکم دیا ہو اور نبی اُس کے کرنے سے منع کر دے، یا اللہ تعالی نے منع کیا ہو اور نبی اُس کو کرنے کا حکم کرے، اللہ تعالی نے حلال بتایا ہو نبی حرام بتائے، یا حرام بتایا ہو اور نبی حلال بتائے، وغیرہ۔

(۳) جس تبدیلی کا مطالبہ کفار نے کیا وہ نبی نہیں کر سکتے، اور آیت بھی اِسی بارے میں اتری ہے، وہ تبدیلی اس طرح کی ہے کہ کفار نے آپ ﷺ سے کہا، کہ جہاں جس کام پر وعید آئی وہاں وعید کو ختم کر دیں، اور جہاں ہمارے بتوں کا عجز ونقص بیان ہوا وہ آیتیں نکال دیں، اور جن باتوں سے ہمیں غصہ آتا ہے وہ قرآن مجید سے نکال دیں۔

(۴) نبی کریم ﷺ نے اپنے الفاظ سے قرآن مجید کے حکم کی تبدیلی بیان کی ہو یا قرآن مجید میں قرآن مجید کے ذریعے ہی حکم کی تبدیلی بتائی ہو، وہ مراد نہیں ہے، بلکہ کوئی دوسری آسمانی کتاب کے ذریعے

قرآن مجید کا حکم نہیں بدلا جا سکتا، کیوں کہ قرآن مجید سب کتابوں کا ناسخ ہے۔

امام احمد بن محمد بن سلامہ ابو جعفر طحاوی حنفی رحمہ اللہ **نسخ القرآن بالسنّة** کا جواز لکھ کر اِسی آیت سے پڑنے والے اعتراض کے جواب میں فرماتے ہیں:

**قِیل لہ و مَن قال لک انّ الحکم الذی نسخ مانسخ من القرآن لیس مِن قِبَلِ اللہ عزوجل اوانّ السنّة لیست عنِ اللہ عزوجل ؟بل ھما عنہُ ینسخ بھماماشاء من القرآن کماینسخ منھماماشاء بالقرآن. [احکام القرآن:۱/۱۶۴]**

اِس معترض کو کہا جائے گا کہ جناب! نبی کریم ﷺ نے قرآن میں سے جو حکم بھی منسوخ کیا یہ کس نے آپ کو کہا کہ وہ نسخ اللہ تعالی کی طرف سے نہیں ہے؟ (اللہ تعالی ہی کی طرف سے ہے) یا کس نے آپ کو کہا کہ سنت اللہ تعالی کی طرف سے نہیں ہے؟ بلکہ قرآن وسنت دونوں اللہ تعالی کی طرف سے ہیں، وہ قرآن مجید میں سے جو چاہتا ہے قرآن وسنت دونوں کے ذریعے منسوخ کرتا ہے، جس طرح قرآن وسنت میں سے جس کو چاہتا ہے قرآن مجید کے ذریعے منسوخ کرتا ہے۔

امام ابو بکر احمد بن علی جصاص (م ۳۷۰ھ) فرماتے ہیں:

**فانّ نسخ القرآن لایجوزعندناالابسنة ھی وحی من قبل اللہ تعالی قال اللہ عزوجلومایـنطق عن الھوی ان ھوالاوحی یوحی فنسخ القرآن بالسنة انماھونسخ بوحی اللہ لامن قبل النبی ﷺ. [احکام القرآن: ۴/۳۷۵]**

ہمارے نزدیک قرآن مجید کا نسخ اُس سنت کے ذریعہ جائز ہے جو اللہ تعالی کی طرف سے وحی ہے، اللہ تعالی کا فرمان ہے کہ نبی اپنی خواہش سے نہیں بولتے، وہ تو وحی ہوتی ہے جو اُن کی طرف بھیجی جاتی ہے، تو سنت کے ذریعے قرآن مجید کا نسخ وحی الٰہی ہی کے ذریعے نسخ ہے نبی کریم ﷺ کی طرف سے نسخ نہیں ہے۔

علامہ محمد عبد العظیم زرقانی (م ۱۳۶۷ھ) جواب میں فرماتے ہیں:

**ان السنة لیست نابغة من نفس الرسول علی انھاھوی منہ وشھوة بل معانیھاموحاة من اللہ تعالی الیہ وکل مااستقل بہ الرسول ﷺ انہ عبرعنھابالفاظ من عندہ فھی وحی یوحی ،ولیست من تلقاء نفسہٖ علی ھٰذاالاعتباروإذن فلیس نسخ القرآن بھاتبدیلالہ من تلقاء نفسہ، انماھوتبدیل بوحی.**

**[مناھل العرفان فی علوم القرآن: ۲/۲۴۰]**

سنت رسول کریم ﷺ کی ذات سے اس حیثیت سے نہیں نکلی ہوتی کہ وہ آپ ﷺ کی خواہش اور

مرضی ہے بلکہ سنت کے مفاہیم اللہ تعالی کی طرف سے حضور ﷺ کی طرف کی ہوئی وحی ہوتے ہیں، اور جس بات کو بھی استقلالاً آپ ﷺ نے اپنے پاس سے الفاظ کے ساتھ تعبیر کیا ہو وہ وحی ہوتی ہے جو آپ ﷺ کی طرف کی گئی ہوتی، اور اس اعتبار سے آپ کی ذات کی طرف سے نہیں ہوتی، اس لئے سنت کے ذریعے قرآن کا نسخ حضور ﷺ کی ذات کی طرف سے تبدیلی نہیں ہے بلکہ وہ تو وحی کے ذریعے ہی تبدیلی ہے۔ (لہٰذا آیت اس کے خلاف نہیں ہے۔)

ان سب تصریحات سے صاف ثابت ہے کہ اسلاف سنت کو وحی سمجھتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ وحی کے ذریعے نبی بتا سکتا ہے کہ یہ حکم عام ہے، اور یہ خاص ہے، یہ مطلق ہے اور یہ مقید ہے، یہ باقی ہے اور یہ منسوخ ہو چکا ہے، وحی ہونے کے سبب (جیسا کہ پہلے تفصیل سے ثابت کیا گیا) سنّت قرآن میں تغیّر و تبدل کر سکتی ہے۔

غامدی صاحب کے یہ بعض اُصول ہیں جن سے متعلق کچھ عرض کرنا ضروری تھا، امید ہے کہ جو غامدی صاحب سے متاثر ہوگا اگر منصف ہوگا تو اُس کو ہماری معروضات درست لگیں گی، ہاں کوئی بات غلط ہو تو اُس کی نشان دہی غامدی صاحب یا اُس کے گروہ کا کوئی صاحب علم کرے تو ان شاء اللہ ہماری طرف سے تصحیح کرنے میں دیر نہ ہوگی۔

البتہ اِن اصولوں کی بنیاد پر غامدی صاحب نے جو نظریات اسلاف سے ہٹ کر پیش کئے ہیں اگر اُن پر بحث نہ کی جائے تو شاید بات نامکمل رہ جائے گی، اس لئے اِن اصولوں کی روشنی میں غامدی صاحب کے بنائے ہوئے نظریات پر بحث بھی مناسب ہے۔

## حیات عیسی ونزول عیسی علیہ السلام کا انکار:

لکھتے ہیں:

> ''نزولِ مسیح کی روایتوں کو اگرچہ محدثین نے بالعموم قبول کیا ہے لیکن قرآن مجید کی روشنی میں دیکھیے تو وہ بھی محل نظر ہے۔'' [میزان: ۱۷۸]

جی! اس لئے کہ محدثین بے چارے اِن اصولوں سے اور قرآن کریم کی سمجھ سے عاری تھے، اور پھر صرف محدثین نہیں بلکہ اُن حدیثوں کو محدثین کے صحیح کہہ دینے کے بعد نبی کریم ﷺ کی امت کے کُل مفسّرین، متکلمین، فقہاء، مؤرخین، علماء، صوفیاء، وغیرہم سب کے سب اتنے سادے بن گئے کہ محدثین کی اندھی تقلید کر لی، اور اُن احادیث کو صحیح مان لیا، اور اُن کے مطابق عقیدہ بنالیا، اور یہ نہ دیکھا کہ یہ سب حدیثیں تو قرآن مجید کے خلاف ہیں۔

**پہلی دلیل:**

اچھا جی! وہ احادیث قرآن مجید کے خلاف کیسے ہیں؟ کہتے ہیں:

اوّلاً: اس لئے کہ مسیح علیہ السلام کی شخصیت قرآن مجید میں کئی پہلوؤں سے زیر بحث آئی ہے، اُن کی دعوت اور شخصیت پر قرآن نے جگہ جگہ تبصرہ کیا ہے، روز قیامت کی ہلچل بھی قرآن کا خاص موضوع ہے، ایک جلیل القدر پیغمبر کے زندہ آسمان سے نازل ہوجانے کا واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے، لیکن موقع بیان کے باوجود اس واقعے کی طرف کوئی ادنیٰ اشارہ بھی قرآن مجید کے بین الدفتین کسی جگہ مذکور نہیں ہے، علم وعقل اِس خاموشی پر مطمئن ہوسکتے ہیں؟ اسے باور کرنا آسان نہیں ہے۔

**جواب:**

اول: تو اِس دلیل کا حاصل یہ ہوا کہ اگر حضرت عیسی علیہ السلام نے قیامت سے پہلے اُترنا ہوتا تو قرآن مجید میں ذکر ہوتا، مگر چوں کہ ذکر نہیں ہوا اس لئے اُن کے نزول کا نظریہ غلط ہے، اِس دلیل میں کوئی وزن نہیں ہے کیوں کہ ایسی بہت سی چیزیں ہیں جن کا ماننا یا عمل کرنا ضروری بھی ہے اور پھر بھی اُن کا ذکر نہیں کیا گیا، تو کیا اُن سب سے متعلق یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ چیزیں ضروری نہیں، اگر ضروری ہوتیں تو اُن کا ذکر قرآن مجید میں ہوتا؟

آخر یہ قرآن مجید کی کونسی نص سے ثابت دلیل ہے کہ عقیدۃً وعملاً وہی چیز ضروری ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں ہو، اور جس کا ذکر قرآن میں نہ ہو وہ کوئی ضروری نہیں ہے؟

دوم: آنجناب کی اپنی من مانی تفسیرِ قرآن اور اپنی فہم قرآن کے مطابق اگر قرآن مجید میں آپ کو اِس کا ذکر نہیں ملا تو اِس میں جناب کا قصورِ فہم ہے، ورنہ قرآن مجید میں اِس کا ذکر کیا گیا ہے۔

**پہلی آیت:**

قرآن مجید میں ہے: **وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا.** (سورہ زخرف آیت ۶۱) اور بیشک وہ قیامت کی آمد کی پہچان ہے، پس تم اُس میں شک نہ کرو۔

اِس آیت سے پہلے کی آیات میں حضرت عیسی علیہ السلام کا تذکرہ چلا آرہا ہے، آیت نمبر ۵۷، ۵۸، ۵۹/ میں اُنہی کا ذکر آیا، اور آیت نمبر ۶۰/ چھوڑ کر پھر اِس آیت نمبر ۶۱/ میں حضرت عیسی علیہ السلام کا ذکر آیا ہے، اِس آیت میں فرمایا کہ وہ قیامت کی آمد کے علم کا ذریعہ ہیں، یعنی جب وہ آئیں گے تو علم ہوجائے گا کہ اب بس آئی قیامت، اب اُس میں زیادہ دیر نہیں ہے۔

حضرت ابن عباس نبی کریم ﷺ سے اِس آیت کی تفسیر روایت کرتے ہیں: **وانہ لعلم للساعۃ**

**قال خروج عیسی قبل یوم القیامۃ. [المستدرک للحاکم رقم ۳۰۰۳، وصححہ الحاکم والذھبی]** یعنی آیت میں قیامت کی علامت یہ ہے کہ قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ظاہر ہوں گے۔

خود حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے: **وَاِنَّہٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَۃِ قال ھو خروج عیسی بن مریم قبیل یوم القیامۃ (اخرجہ احمد وابن ابی حاتم والطبرانی وابن مردویہ، الدر المنثور ۷/ ۳۸۵، واخرجہ الفریابی وسعید بن منصور ومسدد وعبد بن حمید وابن ابی حاتم والطبرانی من طرق، الدر ۷/ ۳۸۶، ابن جریر، الدر)** یعنی آیت سے یہ مراد ہے کہ قیامت کے دن سے کچھ پہلے حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کا ظہور ہوگا۔

مزید حوالہ کے لئے دیکھیں مصنف ابن ابی شیبہ رقم ۳۱۸۷۴، مسند احمد رقم ۲۹۱۸، **بغیۃ الباحث عن زوائد مسند الحارث** رقم ۷۲۰، شرح مشکل الآثار رقم ۹۸۷، ابن حبان الاحسان رقم ۶۸۱۷، معجم طبرانی کبیر ۱۲/۱۵۳ رقم ۱۲۷۴۰، المستدرک رقم ۳۶۷۵۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی یہی تفسیر کرتے ہیں کہ مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہے وہ زمین میں چالیس سال رہیں گے (**الدر المنثور: ۷/۳۸۷**)

یہی تفسیر حضرت مجاہد اور حسن بصری اور قتادہ رحمہم اللہ سے مروی ہے (حوالہ بالا)

امام اسماعیل بن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت ابو ہریرہ، ابن عباس، ابو العالیہ، ابو مالک، عکرمہ، حسن بصری، قتادہ اور ضحاک وغیرہم رحمہم اللہ سے یہی تفسیر نقل ہے، اور رسول اللہ ﷺ سے متواتر احادیث وارد ہیں کہ آپ ﷺ نے قیامت سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق امام عادل بن کر نازل ہونے کی خبر دی ہے، بعض نے "اِنَّـــہٗ" کی ضمیر قرآن مجید کی طرف راجع کی ہے، مگر یہ غلط ہے، بعض نے آیت کا مطلب یہ لیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنے معجزات کے سبب قیامت حق ہونے کی دلیل ہیں، مگر یہ تفسیر بھی غلط ہے۔ (تفسیر ابن کثیر: ۷/۲۱۷)

سدی اور عبد الرحمٰن بن زید سے بھی یہی تفسیر نقل ہے (زاد المسیر: ۴/۸۲، ابن جریر: ۲۹/۶۳۳)

آپ کی مسلّم تفاسیر کشاف اور تفسیر رازی اور تفسیر ابن جریر میں بھی یہی ہے، اور تقریباً تمام مفسرین نے آیت کی اِسی تفسیر کو لیا ہے، حوالے دینے کی ضرورت نہیں، چاہیں تو ساری تفسیروں کی فہرست بنا کر کہہ سکتے ہیں کہ اِن سب تفسیروں میں یہی تفسیر تحریر ہے۔

غامدی صاحب کو چاہیئے تھا کہ "میزان" کے قارئین کو اندھا نہ رکھتے، اور اِن آیتوں کی تفاسیر پر

بحث کرتے تاکہ اِن کی بحث میں جو نقص ہوتا ہم واضح کرتے، بہرحال آیت اور اُس کی تفسیر صحابہ تابعین رحمہم اللہ سے نقل ہے، اور سب مفسرین نے اِسی کو ترجیح دی ہے، اُن سب کے مقابلہ جدید مکلک کی کیا حیثیت ہے کہ اسلاف کی تفسیر چھوڑے اور اپنی رائے منوائے جب کہ غامدی صاحب خود مانتے ہیں کہ:

''علماء محققین نے قرآن کی شرح وتفسیر میں جو کچھ کہا اور جو کچھ لکھا ہے اُسے بھی ہمیشہ پیش نظر رکھا جائے، علم وفن اپنے پیش رووں کی تحقیقات اور فکر ونظر سے استفادہ کر کے ہی آگے بڑھتے ہیں، اُنہیں نظر انداز کر کے کبھی ترقی کے منازل طے نہیں کر سکتے۔'' [میزان: ۵۶]

آنجناب کو خود بھی یہی چیز سامنے رکھنا ضروری تھی اور ہے، ورنہ آپ خود بھی غلط راہ پر چلیں گے، اور چل رہے ہیں، اور پیروکاروں کو بھی غلط راہ پر چلائیں گے اور چلا رہے ہیں۔

یاد رہے کہ غامدی صاحب کے استاد مولا امین احسن اصلاحی صاحب نے اِس آیت کے تحت نزولِ عیسی علیہ السلام کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا، افسوس یہ لوگ مرجوح تفسیریں بیان کرتے ہوئے شاید مرزائیوں کے نظریات کی تردید کرنا مناسب نہیں سمجھتے، اور اُن کا پورا پورا لحاظ رکھنا چاہتے ہیں۔

دوسری آیت:

**وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ (سورہ نساء آیت: ۱۵۹)** ''اور نہیں ہے کوئی اہل کتاب میں سے مگر ضرور ضرور اُن (عیسی علیہ السلام) پر ایمان لائے گا اُن کی موت سے پہلے۔''

اِس آیت سے پہلے کی آیات ۱۵۷، ۱۵۸ میں بھی حضرت عیسی علیہ السلام کا تذکرہ چلا آ رہا ہے، یہود نے حضرت عیسی علیہ السلام کو قتل کرنے کا پروگرام بنایا تھا، اور پھر کہہ دیا تھا کہ ہم نے عیسی علیہ السلام کو قتل کر دیا، اللہ تعالی نے فرمایا اِن یہود کی ان سب باتوں کے سبب اللہ تعالی نے اُن پر مہر لگا دی، اور یہود نے نہ تو عیسی علیہ السلام کو قتل کیا ہے اور نہ سولی دے سکے، لیکن اُن کے سامنے اشتباہ ہو گیا، اور جنہوں نے اُن کے متعلق اختلاف کیا وہ خود بھی شک میں پڑے ہیں، اُنہیں علم کچھ نہیں محض اندازے کی پیروی ہے، اور یقیناً انہوں نے اُن کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالی نے اُس کو اپنی طرف اٹھا لیا، اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

اِس کے بعد وہی آیت ہے جو ہم دلیل بنا رہے ہیں جس میں اللہ تعالی نے فرمایا یہ اہل کتاب (نصاری کے ساتھ یہود بھی جو موجود ہوں گے) حضرت عیسی علیہ السلام کی وفات سے پہلے حضرت عیسی علیہ السلام پر ایمان لے آئیں گے، ظاہر ہے کہ اب تک تو یہود بھی موجود ہیں اور وہ حضرت عیسی علیہ السلام پر ایمان نہیں لائے، تو اب تک وہ وقت نہیں آیا جب کوئی اہل کتاب میں سے ایسا نہ رہا ہو جو عیسی علیہ السلام پر ایمان نہ لے آئے، جس کا مطلب سوائے اِس کے نہیں کہ ایسا وقت قیامت سے پہلے آنے والا ہے اور وہ

تب ہوگا جب عیسیٰ علیہ السلام زمین پر اتریں گے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ابن مردویہ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول اور اُن کے کاموں کا ذکر فرمایا پھر اپنی تائید میں یہی آیت پڑھی۔ **(الدر المنثور: ۷۳۵/۲)**

صحیح بخاری مسلم وغیرہ کی روایت میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نزول عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد بیان کیا پھر حدیث کی تائید میں یہی آیت پڑھی اور فرمایا کہ چاہو تو حدیث کی تائید میں یہی آیت پڑھو۔ **(الدر المنثور: ۷۳۵/۲)**

حضرت ابن عباس، محمد بن حنفیہ، عبدالرحمٰن بن زید، ابو مالک، حسن بصری رحمہم اللہ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔ **(الدر المنثور)** قتادہ سے بھی نقل ہے (ابن جریر) اور ضحاک اور سعید بن جبیر سے بھی نقل ہے۔ (تفسیر القرطبی: ۱۱/۶)

نبی کریم ﷺ اور صحابہ تابعین وغیرہم رحمہم اللہ سے منقول یہ تفسیر بالکل صحیح سندوں سے نقل ہے، اس آیت کے تحت بھی چاہو تو سب تفاسیر دیکھ لو، مفسرین نے اِس تفسیر کو لیا ہے، اور درست مانا ہے، کسی نے کسی قسم کی جرح نہیں کی ہے، پھر یہ کہنا کس طرح درست ہوا کہ جی اِس کا ذکر قرآن مجید میں نہیں کیا گیا لہٰذا غامدی صاحب کی عقل کیسے باور کرے؟

**جناب امین احسن اصلاحی کا انصاف:**

اس آیت کے ذیل میں جناب امین احسن اصلاحی صاحب نے نبی کریم ﷺ سے منقول آپ ﷺ کے صحیح ارشاد اور صحابہ تابعین رحمہم اللہ کی صحیح تفسیر کو کوئی اہمیت نہیں دی بلکہ اِس کے مقابلہ میں عکرمہ سے منقول تفسیر کو لیا، لکھتے ہیں:

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ سلف میں سے عکرمہ پہلی ضمیر **(لیومنن بہ)** کا مرجع آنحضرت ﷺ کو مانتے ہیں، لیکن عام طور پر لوگوں (عُلماء) نے اس بُعد کے سبب جو ایک طویل جملہ معترضہ نے پیدا کر دیا ہے، اس قول کو اہمیت نہیں دی، حالاں کہ جملہ معترضہ سے جو بُعد پیدا ہوتا ہے وہ قابلِ لحاظ نہیں ہوتا، ایسی صورت میں اس سے صَرف نظر کر کے سلسلہ کلام کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ (تدبر قرآن: ۴۲۳/۲)

جناب! حضرت عکرمہ سے دونوں تفسیریں منقول ہیں:

(۱) تفسیر طبری میں یہ تفسیر بھی نقل ہے جو اصلاحی صاحب نے بیان کی ہے۔

**قال عکرمة لایموت النصرانی والیهودی حتی یومن بمحمد ﷺ یعنی فی**

**قولہ وان من اہل الکتاب الاالخ (طبری ۷/۲/۶۷)** آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ کوئی عیسائی اور یہودی نہیں مرے گا یہاں تک کہ حضور ﷺ پر ایمان لائے۔

اِس تفسیر کے مطابق **بہٖ** کی ضمیر نبی کریم ﷺ کی طرف راجع ہے۔

(۲)**قال لایموت احدھم حتی یؤمن بہ یعنی بعیسی (۷/۷۰/۶)** عکرمہ نے فرمایا کہ جو یہودی بھی ہے وہ نہیں مرے گا یہاں تک کہ اُس پر یعنی عیسی علیہ السلام پر ایمان لے آئے گا.

اس تفسیر کے مطابق **لیؤمنن بہٖ** میں **بہٖ** کی ضمیر حضرت عیسی علیہ السلام کی طرف راجع ہے۔

یہ تفسیر راجح ہے:

اول: اس لئے کہ اِس تفسیر کی تائید اوپر نبی کریم ﷺ کی صحیح حدیث سے نقل کی گئی ہے۔

ثانی: عکرمہ شاگرد ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے، اور زیادہ تر وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ہی تفسیر لیتے ہیں، اور اُن کے استاذ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر بھی یہی ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے دوسرے شاگرد حضرت مجاہد رحمہ اللہ سے، اور تیسرے شاگرد حضرت سعید بن جبیر سے بھی یہی تفسیر نقل ہے۔ (قرطبی)

ثالث: اصلاحی صاحب کی عکرمہ سے نقل کی ہوئی تفسیر میں عکرمہ اکیلے ہیں، اُن کے سوا کسی سے منقول نہیں ہے، جب کہ دوسری تفسیر عکرمہ سے بھی نقل ہے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی، اور محمد بن حنفیہ، عبدالرحمٰن بن زید، ابو مالک، حسن بصری اور ابن سیرین، اور سدی رحمہم اللہ سے بھی منقول ہے، امام ابن جریر نے اِسی تفسیر کو اصح کہا ہے، اور ابن کثیر نے اِسی کو صحیح کہا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

رابع: ایمان بھی کہتا ہے کہ جو تفسیر حضور ﷺ سے صحیح ثابت ہے اُسی کو ترجیح دی جائے، کیوں کہ نبی کریم ﷺ اصل شارحِ قرآن ہیں، آپ ﷺ کی بیان کی ہوئی شرح کے مقابلہ میں کسی کا قول اور تفسیر کیا حیثیت رکھتا ہے؟ نبی کریم ﷺ کے بعد پھر کسی صحابی سے جو تفسیر صحیح منقول ہو اُسی کو ترجیح ہونی چاہیے، صحابی کے مقابلہ میں بعد والے کی تفسیر کو کیوں ترجیح دی جائے؟

خامس: اگر عکرمہ سے منقول اصلاحی والی تفسیر مان لی جائے، تو دونوں تفسیروں میں تطبیق وتوفیق ممکن ہے، ہر یہودی اور عیسائی کو اپنی موت کے وقت علم ہو جائے گا کہ واقعی نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کی تعلیمات سب حق ہیں، اور وہ موت کے وقت ایمان لے آئے گا مگر اُس وقت کا ایمان قابل قبول نہیں، ایسے

ہی ہر یہودی کو اپنی موت کے وقت عیسی علیہ السلام کے نبی ہونے کا یقین ہو جاتا ہے، اور ایمان لاتا ہے مگر وہ ایمان قبول نہیں ہے۔

ایسے ہی جب قیامت سے کچھ پہلے حضرت سیدنا عیسی علیہ السلام نزول فرمائیں گے، تو وہ عیسائی جو حضرت عیسی علیہ السلام پر ایسا ایمان نہیں رکھتے جو واقعی ایمان کہلائے، اور یہودی جو بالکل ان پر ایمان نہیں رکھتے جب حضرت عیسی علیہ السلام کو پائیں گے، تو وہ عیسی علیہ السلام پر ایمان لے آئیں گے، اور جو ایمان نہ لائیں گے وہ قتل کر دیئے جائیں گے۔

## غامدی صاحب کی دوسری دلیل:

لکھتے ہیں:

”ثانیاً اس لئے کہ سورہ مائدہ میں قرآن نے مسیح علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالی کا ایک مکالمہ نقل کیا ہے جو قیامت کے دن ہوگا، اُس میں اللہ تعالی اُن سے نصاری کی اصل گمراہی کے بارے میں پوچھیں گے کہ کیا تم نے یہ تعلیم اُنہیں دی تھی کہ مجھ کو اور میری ماں کو خدا کے سوا معبود بناؤ، اُس کے جواب میں وہ دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی کہیں گے کہ میں نے تو اُن سے وہی بات کہی جس کا آپ نے حکم دیا تھا، اور جب تک میں اُن کے اندر موجود رہا اُس وقت تک دیکھتا رہا کہ وہ کیا کر رہے ہیں، لیکن جب آپ نے ”مجھے اٹھا لیا“ تو میں نہیں جانتا کہ اُنہوں نے کیا بنایا اور کیا بگاڑا ہے، اُس کے بعد تو آپ ہی اُن کے نگران رہے ہیں۔

اِس میں دیکھ لیجیے مسیح علیہ السلام اگر ایک مرتبہ پھر دنیا میں آچکے ہیں تو یہ آخری جملہ کسی طرح موزوں نہیں ہے، اِس کے بعد اُنہیں کہنا چاہیئے کہ میں اِن کی گمراہی کو اچھی طرح جانتا ہوں اور ابھی کچھ دیر پہلے انہیں اس پر متنبہ کر کے آیا ہوں.... (میزان: ۱۷۸)

## جواب:

اپنی عقل سے سوچتے ہوئے جناب عالی نے اِس عبارت میں (قرآن مجید کی دو آیات سے حیات ونزول عیسی علیہ السلام ثابت ہو جانے کے بعد) قرآن مجید کی دو قسم آیات اور احادیث متواترہ کے درمیان اختلاف اور تعارض مان لیا، گویا کہ **”وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا“** کی تائید کرنا چاہ رہے ہیں، اللہ کے بندے! یہ تعارض آپ کا اپنا گھڑا ہوا ہے، ایسے تعارضات خود عقل سے گھڑ کر قرآن مجید اور احادیث نبوی کی تکذیب کی راہ پیدا کر رہے ہیں، اور پھر بھی اپنے محقق ہونے پر نازاں

ہیں، آنجناب کو آیات کا اپنی عقل سے اختراعی مطلب گھڑنے کی سوجتی ہے اور پھر گھڑنتو مطلب کے سبب جب تعارض پیدا ہو جاتا ہے تو خود بھی پریشان ہوتے ہیں، اور اپنی کتابوں کے قارئین کو بھی پریشان کرتے ہیں، مجھے غلبہ ظن کے درجہ میں یہ خیال ہے کہ ایسے اشکالات اور پریشانیاں پیدا ہونے پر آپ نے کبھی کسی صاحب علم سے اُس کے رفع کرنے کے لئے رجوع کرنے کی زحمت ہی گوارہ نہیں کی، بلکہ اول میں بھی اور آخر میں بھی اپنی عقل ہی کے گھوڑے دوڑائے، سنیئے!

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ **توفیتنی** سے مراد آسمان کی طرف اٹھا کر پورا لے لینا ہے جیسے **انّی متوفیک ورافعک** سے یہی مراد ہے۔ (تفسیر الرازی: ۱۲/۴۶۶)

علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ "**توفیتنی**" کا معنی ہے کہ جب آپ نے آسمان کی طرف اٹھا کر مجھے پورا لے لیا، یہی حضرت حسن بصری سے منقول ہے، اور اسی پر جمہور متفق ہیں، اور جبائی (معتزلی) کہتا ہے کہ اِس کا معنی ہے کہ آپ نے مجھے موت دے دی، اور جبائی کا دعوی ہے کہ پہلے حضرت عیسی علیہ السلام کی وفات ہوگئی پھر آسمان کی طرف اٹھالئے گئے، نصاری بھی اِسی نظریہ کی طرف گئے ہیں۔ (روح المعانی)

امام محی الدین بغوی (صاحب مصابیح السنۃ) رحمہ اللہ نے بھی یہی معنی کیا ہے (معالم التنزیل) سب ہی عربی تفسیروں میں یہ تفسیر کی گئی ہے۔

اگر توفی کے معنی وفات پا جانے کے ہوں تو بھی یہ آیت حضرت عیسی علیہ السلام کے اِس وقت فوت شدہ ہونے کی دلیل نہیں، اور آسمان پر زندہ ہونے کے خلاف نہیں ہے کیوں کہ یہ مکالمہ قیامت کے دن ہوگا، اور اُس سے پہلے تو ظاہر ہے کہ وفات پا جائیں گے۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

(**ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ** میں گو تصریحاً تو سوال اس کا ہے کہ آپ نے ایسا کلمہ کہا ہے یا نہیں، لیکن اشارۃً اس کا بھی سوال معلوم ہوتا ہے کہ یہ عقیدہ تثلیث کہاں سے پیدا ہوا، پس عیسی علیہ السلام اس باب میں یوں عرض کریں گے کہ) میں اُن (کی حالت) پر مطلع رہا جب تک ان میں (موجود) رہا (سو اس وقت کا حال تو میں نے مشاہدہ کیا ہے، اس کے متعلق بیان کر سکتا ہوں) پھر جب آپ نے مجھ کو اٹھا لیا (یعنی اول بار میں تو زندہ آسمان کی طرف اور دوسری بار میں وفات کے طور پر) تو (اس وقت صرف) آپ ان (کے احوال) پر مطلع رہے (اس وقت مجھ کو خبر نہیں کہ اُن کی گمراہی کا سبب کیا ہوا، اور کیونکر ہوا) اور آپ ہر چیز کی پوری خبر رکھتے ہیں۔ (بیان القرآن: جلد ۳، صفحہ ۷۵)

معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اُس وقت سے متعلق اپنی لاعلمی کا اظہار کررہے ہیں جب آسمان پر تھے اور اُس وقت بھی جب دنیا سے بالکلیہ وفات پالی ہوگی، ظاہر ہے کہ ان دونوں اوقات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب قوم میں موجود ہی نہیں تھے تو اُن کے کرتوتوں کا علم بھی نہیں تھا تو سوائے اپنی لاعلمی کے اور اللہ تعالی کے علم کے اور کیا فرماتے؟ تو آیت کا اِس مسئلہ سے ذرا بھی تعلق نہیں ہے۔

البتہ اوپر کی عبارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ غامدی صاحب نصاری اور معتزلہ کے ہم خیال ہیں، اِس بارے میں جو نظریات غامدی صاحب کے ہیں وہی اُن کے ہیں، بلکہ مرزائیوں کی طرف سے بھی غامدی صاحب کو تائید حاصل ہے، کیوں کہ وہ لوگ بھی یہی آیتیں پڑھ کر وفاتِ مسیح ثابت کرتے ہیں، غامدی صاحب کو غیرت کرنی چاہئے اور سوچیں کہ اُنہیں کن کے ساتھ کھڑا ہونا پسند لگ رہا ہے؟

**تیسری دلیل:**

لکھتے ہیں:

> ''ثالثاً: اس لئے کہ سورہ آل عمران کی ایک آیت میں قرآن نے مسیح علیہ السلام کے بارے میں قیامت تک کا لائحہ عمل بیان فرمایا ہے، یہ موقع تھا کہ قیامت تک کے الفاظ کی صراحت کے ساتھ جب اللہ تعالی وہ چیزیں بیان کررہے تھے جو اُن کے اور اُن کے پیروؤں کے ساتھ ہونے والی ہیں تو یہ بھی بیان کردیتے کہ قیامت سے پہلے میں ایک مرتبہ پھر تجھے دنیا میں بھیجنے والا ہوں، مگر اللہ نے ایسا نہیں کیا، سیدنا مسیح کو آنا ہے تو یہ خاموشی کیوں ہے؟ اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، آیت یہ ہے:
>
> **اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ ومُطَھِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْاوَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْااِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ ،۔۔۔**(میزان:۱۷۹)

**جواب:**

اول: تو اتنی بات ہوئی کہ اللہ تعالی نے دوبارہ نزول کا یہاں ذکر نہیں فرمایا، تو ذکر نہ فرمانا نزول نہ ہونے کی دلیل کیسے ہے؟ یہ تو ایسے ہے جیسے کئی منکرینِ حدیث کی منطق یہ ہے کہ قرآن مجید میں وضو کا ذکر ہے اور اُس میں چار کام ذکر ہیں، پانچواں کوئی کام ذکر نہیں، تو حدیثوں میں جو مزید کام ذکر ہوئے وہ قرآن مجید کے خلاف ہیں، تو کیا اِسی کو قرآن کے خلاف ہونا کہتے ہیں؟

ثانی: **الی یوم القیامة** کا تعلق آیت کے سارے حصے سے نہیں ہے بلکہ آخری حصہ **''وجاعل الذین اتبعوک فوق الذین کفروا''** سے ہے، حضرت عیسی علیہ السلام کے متبعین کی کئی صورتیں ہیں، کامل درجہ میں حضرت عیسی علیہ السلام کے متبعین وہ ہیں جنہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کا کلمہ پڑھ لیا، اور محمدی

بن گئے، اور واقعۃً مسلمان تعداد وغیرہ میں اُن یہود سے زیادہ ہیں جو حضرت عیسی علیہ السلام کا انکار کر کے **"الذین کفروا"** کا مصداق بن گئے، دوسرے درجہ میں وہ عیسائی بھی متبعین میں شامل ہیں جنھوں نے عیسی علیہ السلام کو نبی مان لیا، یہ لوگ بھی یہود سے فوق (غالب) ہیں، یہود کا حال تو یہ ہے کہ اگر اُنہیں دیگر طاقتوں کی پشت پناہی حاصل نہ ہو تو ذرا سے عرصہ میں ختم کئے جاسکتے ہیں، تو جو دوسروں کے بل بوتے پر زندگی گذارتے ہوں وہ مغلوب نہیں تو کیا ہیں؟ پھر زمانہ کے اعتبار سے حضرت عیسی علیہ السلام کے آخری متبعین وہ بھی ہوں گے جو اُن کے ساتھ ہو کر یہود و ہنود سے جہادی معرکے لڑیں گے، دجال اور اُس کے کارندوں کو ختم کریں گے، وہ بھی واقعۃً غالب ہوں گے، اور دجالی لوگ شکست خوردہ ہوں گے **ان شاء اللہ!**

**ثالث:** یہ آیت کم از کم اتنا تو ظاہر کرتی ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام آسمان پر اٹھالئے گئے ہیں، تو اتنا اِس آیت سے ثابت ہوا، مزید احادیث سے صاف صاف ظاہر ہوا کہ قیامت سے پہلے زمین پر اتریں گے، تو جو آیت سے ثابت ہے وہ احادیث میں بھی ہے، اور جو احادیث میں ہے آیت میں اُس کی نفی نہیں ہے، پھر آپ کی ناقص عقل اُن احادیث کو اِس آیت کے خلاف کیوں سمجھے ہوئے ہے؟

اچھا ذرا مفسرین سے اِس آیت کی تفسیر سن لیجیے!

**انّی متوفیک ورافعک:** میں تجھے زمین سے پورا پورا لے لوں گا، آپ کو یہود کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے، اِسی مطلب میں ہے **فلما توفیتنی** یعنی جب آپ نے مجھے بغیر موت آسمان پر اٹھالیا، یہ معنی اس لئے ہے کہ نصاری اُن کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد تبدیل ہوئے نہ کہ اُن کی موت کے بعد۔

**انــــی متــوفیک ورافــعک:** یہاں تقدیم و تاخیر ہے یعنی میں تجھے اپنی طرف اٹھالوں گا اور کافروں سے پاک رکھوں گا، اُس کے بعد تجھے وفات ہوں گا۔

**ومطھرک من الذین کفروا:** اللہ تعالی نے اُن کے سامنے سے اُن کو اٹھالیا (اس طرح پاک رکھا) ۲: قتل سے اُن کو روک لیا (قتل نہ ہونے دیا)۔

**جــاعـل الـذیـن اتبعـوک:** مراد متبعین سے حضور ﷺ کی امت ہے کیوں کہ اُن کی نبوت کی اور روح اللہ، کلمۃ اللہ ہونے کی تصدیق کی، ۲: مراد نصاری ہیں وہ یہود سے فوق ہیں، یہود ذلیل و خوار ہیں۔

**(زادالمسیر لابن الجوزی ۱/ ۲۸۷، ۲۸۸)**

مزید کسی تفسیر کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں ہے، دعوی کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اِس آیت کے تحت سب مفسرین نے حضرت عیسی علیہ السلام کا آسمان پر زندہ ہونا، اور پھر زمین پر قیامت سے پہلے آنا بیان کیا ہے، غامدی صاحب پیش رووں کے پیچھے چلیں ورنہ اپنے بقول بھی علمی عملی، روحانی، دینی کسی طرح ترقی

نہیں کر سکیں گے، اسلاف فرماتے ہیں کہ حضرت عیسی علیہ السلام کی حیات اور نزول کا انکار کفر ہے۔

علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **وجب الایمان بہ واکفر منکرہٗ کالفلاسفة من نزول عیسی علیہ السلام فی آخر الزمان.** (روح المعانی ۲۲/۳۴) نزول عیسی علیہ السلام پر ایمان واجب ہے اور آخر زمانہ میں نزول عیسی علیہ السلام کے منکر کو جیسے فلاسفہ ہیں کافر قرار دیا گیا۔

علامہ محمد انور شاہ کشمیری (م ۱۳۵۳ھ) رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

**انه قدتواتر وانعقدالاجماع علی نزول عیسی ابن مریم علیه السلام فتأویل هٰذه وتحریفهٗ کفر ایضاًوقدقال فی روح المعانی وهومن محققی المتأخرین ان من لم یقل بنزولهٖ فقداکفره العلماء وهوعلی القاعدة فی انکارماتواترفی الشرع** (اکفار الملحدین)

تحقیق حضرت عیسی علیہ السلام کا نزول متواتر ہے اور اس پر اجماع ہو چکا ہے، تو اِس کی تاویل اور تحریف بھی کفر ہے، روح المعانی میں علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے فرمایا (یہ متأخرین محققین میں سے ہیں فرمایا) بیشک جو نزولِ عیسی کا قائل نہیں اس کو علماء نے کافر قرار دیا یہ اس قاعدہ کی بناء پر ہے کہ شریعت میں جو متواتر ہو اس کا انکار کفر قرار دیا گیا۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ (م ۹۱۱ھ) اپنے ایک مخاطب سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: **فیلزمک علیه احدامرین امانفی نزول عیسی اونفی النبوة عنه وکلاهماکفر.** (الحاوی للفتاوی ۲/۱۶۶) اس کی بناء پر آپ پر دو میں سے ایک بات لازم آئے گی یا نزول عیسی علیہ السلام کی نفی کرو یا ان کی نبوت کی نفی کرو (تب نزول کے بعد ان پر وحی نہ اترنے کا قول کرو) جب کہ یہ دونوں باتیں کفر ہیں۔

علامہ عبدالرؤف مناوی مصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **وقدحکی فی المطامح اجماع الامة علی نزولهٖ وانکرابن حزم ماحکاه فی مراتب الاجماع من الخلاف فی نزولهٖ قبل یوم القیامة وقال هذانقل مضطرب ولم یخالف احدمن اهل الشریعة فی ذالک وانماانکره الفلاسفة والملاحدة** (فیض القدیر ۵/۹۱۵) اور مطامح میں نزول عیسی علیہ السلام پر اجماع نقل کیا ہے اور ابن حزم نے جو مراتب الاجماع (ص ۱۷۳) میں نزول عیسی میں اختلاف نقل کیا اُس پر نکیر کی ہے اور فرمایا کہ یہ نقل مضطرب (بے اعتبار و بے ثبوت) ہے شریعتِ محمدیہ کے ماننے والوں میں سے کسی نے نزول عیسی کے عقیدہ سے اختلاف نہیں کیا محض فلاسفہ اور ملحد لوگوں نے نزول عیسی کا انکار کیا ہے۔

معلوم ہوا کہ نزول عیسی کا انکار مسلمانوں سے ثابت نہیں، ملحد لوگ ہی منکر ہیں، تو غامدی صاحب

کو اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیے۔

## ظہور مہدی کا انکار:

غامدی صاحب لکھتے ہیں:

”ظہور مہدی کی روایتیں محدثانہ تنقید کے معیار پر پوری نہیں اترتیں، اُن میں کچھ ضعیف اور کچھ موضوع ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ بعض روایتوں میں جو سند کے لحاظ سے قابل قبول ہیں ایک فیاض خلیفہ کے آنے کی خبر دی گئی ہے، لیکن دِقت نظر سے غور کیا جائے تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اس کا مصداق سیدنا عمر بن عبدالعزیز تھے جو خیر القرون کے آخر میں خلیفہ بنے، رسولُ اللہ ﷺ کی یہ پیشین گوئی ان کے حق میں حرف بہ حرف پوری ہو چکی ہے، اس کے لئے کسی مہدی موعود کے انتظار کی ضرورت نہیں ہے۔“

(میزان: ۱۷۷، ۱۷۸)

## جواب:

بہت سی احادیث اس بارے میں صحیح یا حسن بھی ہیں اور اُن میں امام مہدی کی صفات ایسی بیان ہوئیں جو حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ پر چسپاں ہی نہیں ہو سکتیں، مثلاً:

رسول اللہ ﷺ نے امام مہدی سے متعلق ارشاد فرمایا:

**رجل من اهل بيتي**، امام مہدی میرے اہل بیت میں سے ایک آدمی ہوگا۔

اس کے راوی: حضرت ابو سعید خدری، حدیث صحیح، مصنف ابن ابی شیبہ [۳۷۶۳۹]، مسند احمد [۱۱۱۳۰]، مسند ابی یعلی [۹۸۷]، ابن حبان [۶۸۲۳، ۶۸۲۶، رجالہ ثقات، حدیث صحیح]، عبداللہ بن مسعود: مصنف ابن ابی شیبہ [۳۷۷۲۷]، مسند احمد [۳۵۷۱]، ابن حبان [۶۸۲۴]، ابو ہریرہ: حدیث صحیح، حسن سنن ابن ماجہ [۲۷۷۹]، مسند ابی یعلی [۶۶۶۵]، **السنن الواردة فی الفتن للدانی** [۵۷۲]، عوف بن مالک: **المعجم الكبير** [۱۸/۵۱، ح ۹۱]، حضرت علی: ابوداؤد [۴۲۸۳، حدیث صحیح]، مسند احمد [۷۷۳]، حذیفہ: مسند الرویانی، بحوالہ مرقات شرح مشکوۃ [۳۴۳۹/۸]

**المهدی من ولدی، من ولد فاطمة**، مہدی میری اولاد میں سے ہوگا، حضرت فاطمہ کی اولاد سے ہوگا۔ روایت کرنے والے حضرت ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا: ابوداؤد [۴۲۸۴، حدیث صحیح] ابن ماجہ [۴۰۸۶، صحیح]

**المهدی مناا هل البيت**. مہدی ہم اہل بیت میں سے ہوگا۔ روایت کرنے والے، حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں: ابن ماجہ [۴۰۸۵، حدیث حسن]

**یواطیء اسمہٗ اسمی ،واسم ابیہ اسم ابی.** اُس کا نام میرے نام سے ملتا ہوگا، اُس کے والد کا نام میرے والد کے نام پر ہوگا۔

حدیث کا یہ مضمون حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے حسن صحیح سند سے نقل ہے، (امام ترمذی [سنن رقم ۲۲۳۰، ۲۲۳۱] مسند احمد [۳۵۷۱، ۳۵۷۲، ۳۵۷۳، ۴۰۹۸، ۴۲۷۹] ابوداوٗد [۴۲۸۲] **المسندللشاشی** [۶۳۵] ابن حبان [۵۹۵۴، ۶۸۲۴] **المستدرک** [۸۴۳۴] **السنن الواردۃ فی الفتن للدانی** [۵۵۴، ۵۵۵]

یہ مضامین بالکل صحیح یا حسن درجہ کی سندوں سے مروی ہیں ، ظاہر ہے کہ نہ تو حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا نام محمد ہے، نہ اُن کے والد کا نام عبداللہ ہے، نہ وہ اہل بیت میں سے ہیں، نہ اولادِ فاطمہ سے ہیں، تو پھر وہ امام مہدی سے متعلق مروی روایات کا مصداق کیسے بن سکتے ہیں ؟ اگر لغوی طور پر اُن کو مہدی کہا جائے تو کہا جاسکتا ہے، مگر وہ تو اُن کی خصوصیت نہیں ہے، بلکہ ہر ہدایت یافتہ مہدی کہا جاسکتا ہے۔

بہر حال غامدی صاحب کا مخصوص امام مہدی محمد بن عبداللہ فاطمی کے ظہور کا انکار بھی سخت گمراہی ہے۔

## مخصوص دجال کا من گھڑت تصور:

علاماتِ قیامت میں سے دجال سے متعلق غامدی صاحب کہتے ہیں:

> ”۵: دجال، یہ بڑے دغاباز، فریبی، اور مکار کے معنی میں اسم صفت ہے، اس کا ذکر **المسیح الدجال** کے نام سے بھی ہوا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ قیامت سے پہلے کوئی شخص مسیح ہونے کا جھوٹا دعوی کرے گا، اور مسلمانوں، یہودیوں، اور عیسائیوں کے اندر سیدنا مسیح کی آمد کے تصور سے فائدہ اٹھا کر اپنے بعض کمالات سے لوگوں کو فریب دے گا، بعض روایتوں میں ہے کہ یہ ایک آنکھ سے اندھا ہوگا، اور ایمان والوں کے لئے اس کا دجل اتنا واضح ہوگا کہ اس کی پیشانی پر گویا کفر لکھا ہوا دیکھیں گے۔“ (میزان: ۱۷۷)

دجال سے متعلق غامدی صاحب کی یہ تعبیر ایک افسانہ اور کہاوت بنانے کا سا انداز ہے، یہ تصور اُس دجال کا نہیں ہے، جس کی مکمل تصویر متعدد کافی احادیث میں آئی ہے، وہ اپنی خدائی کا دعویدار ہوگا، اور خدا تعالی کی کاریگریوں کے طرز پر کئی کاریگریاں دکھائے گا، وہ اللہ تعالی کی طرف سے ایک سخت امتحان ہوگا، وہ اپنے عیسی علیہ السلام ہونے کا دعویدار نہیں ہوگا، نہ ہی نزولِ عیسی کے تصور کے سبب انسانوں کو ورغلائے گا، غامدی صاحب یہ تصویر اس لئے پیش کر رہے ہیں تاکہ اہلِ حق نزولِ مسیح علیہ السلام کے عقیدہ سے روگردانی کرلیں۔

(جاری ہے۔)

مولانا خادم حسین بدر قسط: ۵

# کتاب ''ذکر اللہ کے حلقے'' کا تحقیقی جائزہ

☆......حکیم الامت مجدد دین وملت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی کی خانقاہ کا حال سنیے:

حضرت کی خانقاہ کے موجودہ بزرگ اور امداد العلوم مدرسہ کے مہتمم حضرت مولانا سید انجم الحسن صاحب تھانوی لکھتے ہیں: حکیم الامت حضرت مولنا اشرف علی تھانویؒ کے یہاں اجتماعی معمولات تھے ہی نہیں۔ ہر شخص کے لیے اس کے حسب حال نسخہ تجویز ہوتا تھا۔ اور وہ اپنے معمولات اپنے اپنے حجروں میں پورے کرتا۔ سالکین کے لیے خانقاہ میں تقریباً پچاس (۵۰) حجرے تھے۔ تہجد کے وقت خانقاہ کی ایسی کیفیت ہوتی تھی، جیسے شہد کے چھتے پر شہد کی مکھیوں کی بھن بھناہٹ ہوتی ہے، کسی قسم کا شور وغل نہ ہوتا۔ الخ۔

[اجتماعی ذکر مجلسوں کا شرعی حکم: ۱۸۰]

☆......مفتی عبد الرؤف سکھروی زید مجدہم فرماتے ہیں:

حضرت ڈاکٹر صاحبؒ کی مجلس (حضرت ڈاکٹر عبد الحئی عارفیؒ کی مجلس) اوپر عرض کیا کہ شروع میں حضرت والاؒ کی مجلس پاپوش نگر میں جمعہ کے روز ہوا کرتی تھی۔ اس مجلس میں پہلے حضرت تھانویؒ کے ملفوظات سنائے جاتے تھے۔ اس کے بعد حضرت والا کا مختصر بیان ہوتا تھا اور آخر میں حضرت اپنے مخصوص انداز میں طویل مگر بڑی والہانہ دعا فرماتے تھے۔ الخ [البلاغ کا حضرت ڈاکٹر عبد الحئی عارفیؒ نمبر: ۲۹۷]

☆......مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیعؒ کی مجلس: مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

حضرت والدؒ کی ایک مجلس ارشاد ہر اتوار کو عصر سے مغرب تک ہوتی تھی۔ یہ کئی سال لسبیلہ چوک کے پاس اشرف منزل میں اور اس کے بعد دار العلوم کورنگی میں آخر حیات تک جاری رہی۔ اس مجلس میں دور دور سے بلکہ دوسرے شہروں سے بھی لوگ جوق در جوق آتے۔ بڑی پر کیف مجلس ہوتی، اس میں دل کی دنیا ہی موضوع گفتگو ہوتی۔ بزرگوں کے واقعات وملفوظات، پر اثر اشعار، علمی باریکیوں کا دلنشین بیان، لطائف و ظرائف، احکام وحکم، موجودہ دور کے شبہات اور ان کا حل، نفس وشیطان کی دقیق حیلہ سازیاں اور ان کا علاج، سب ہی کا اثر انگیز بیان ہوتا، جو دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا تھا۔ کتنی ہی زندگیوں میں اس مجلس میں خوشگوار انقلاب آچکا تھا۔ (البلاغ کا حضرت ڈاکٹر عبد الحئی عارفیؒ نمبر ص ۱۴۴)

☆......مظہر الملۃ والدین قاضی مظہر حسین صاحبؒ لکھتے ہیں:

چوں کہ اجتماعی ذکر جہر میں مفاسد پیدا ہوتے ہیں، اس لیے اکابر مشائخ دیوبند حضرت گنگوہی، حضرت تھانوی، حضرت مدنی اور حضرت رائے پوری رحمہم اللہ تعالیٰ نے مروجہ مجالس ذکر منعقد نہیں کرائیں، نہ ہی اپنے خلفاء کو حکم دیا۔ اور نہ ہی ان کے سلسلوں میں اجتماعی ذکر جہر کا عمل پایا جاتا ہے۔ اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی کے بعض خلفاء سے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ مروجہ مجالس ذکر حضرت شیخ الحدیث نے نہیں کرائیں۔ (ماہنامہ حق چاریار اوکاڑوی نمبر: ۵۷، ۵۸)

☆......فخر السادات سیدی و مرشدی حضرت اقدس سید نفیس الحسینی شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

حضرت مدنیؒ اور حضرت رائے پوریؒ بھی سفر کرتے تھے۔ لیکن جہاں جاتے، وہاں اپنے معمول کے مطابق جو ان کے ذکر کے اوقات تھے، ان میں ذکر کرتے۔ اس طرح مجالس کا انعقاد نہیں کرتے تھے۔ الخ

مجالس نفیس: ۲۲۲، ۲۲۳)

☆......صاحبزادہ مولانا محمد حسین للّٰہی خلیفہ مجاز حضرت اقدس شاہ عبدالقادر رائے پوری لکھتے ہیں:

بعض مشائخ جو ذکر کی اجتماعی مجلس (یعنی جمع صوری) کرتے کراتے ہیں۔ وہ صرف مسترشدین کی تعلیم کے لیے اور ذکر کو رواں رکھنے کے لیے کراتے ہیں۔ اور اس مجلس میں ہر شخص اپنا اپنا ذکر کرتا ہے، کیوں کہ آواز ملا کر ذکر، لاؤڈ اسپیکر پر ذکر کرنے کو مشائخ نے بدعت بتلایا ہے۔

بہت سے لوگوں کے یہاں اس میں (ذکر) بدعت کا رنگ آ گیا اور اس کو خراب کر دیا اور اس کے فوائد تزکیہ نفس، طہارت روح اور اس پر جو ثواب اور رضائے الٰہی ملتی ہے، اس سے اس کو محروم کر دیا۔ کیوں کہ بعض لوگ ایسے الفاظ سے ذکر کرتے ہیں اور یک جا و یک آہنگ ہو کر لاؤڈ سپیکر پر ذکر کرتے ہیں۔ جس کا ثبوت آں حضرت ﷺ سے نہیں، نہ آپ نے حکم دیا، نہ اجازت۔ تو عبادت ذکر ایک عظیم الشان اور فضیلت والی عبادت جب اس کمیت و کیفیت میں بدعت کا رنگ آ گیا تو اس کا اثر ختم اور کرنے والا اجر و ثواب سے محروم ہو گیا۔ الخ (تجلیات حق: ۱۲۳ تا ۱۲۵)

☆......شیخ الحدیث مفتی محمد صدیق صاحبؒ لکھتے ہیں: اکابر اہل السنۃ دیوبند قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اور شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ اسرارہم نے کبھی اجتماعی طور پر ذکر جہر کی مجالس منعقد نہیں کیں اور نہ ہی ان کے خلفاء نے ایسی کرائی ہیں۔ (ذکر و اعتکاف میں مروجہ بدعات: ۳۶)

☆......فقیہ العصر حضرت سید مفتی عبدالشکور صاحب ترمذیؒ لکھتے ہیں: حضرت شیخ الحدیثؒ کے

ذکر کی تاکید فرمانے سے اجتماعی ذکر کا ثبوت تو لازم نہیں آتا، انفراداً ذکر اللہ کی کثرت بتلائی جائے تو بھی مقصود حاصل ہے۔ جیسا کہ مظاہر علوم سہارنپور اور خانقاہ تھانہ بھون میں عمل تھا۔ یہی طرز خانقاہ رائے پور کا رہاں خانقاہوں میں اجتماعی نہیں بلکہ انفرادی ذکر کی ہمیشہ بکثرت تلقین ہوتی رہی اور اس پر عمل رہا۔

(حیات ترمذی ص ۴۴۱، ۴۴۲)

☆......حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانویؒ فرماتے ہیں: اس طرح ذکر کرنا ٹھیک نہیں، اس طرح سے ذکر کرنا نہ صحابہ سے ثابت ہے اور نہ ہی ہمارے اکابرین سے۔ البتہ ہمارے اکابرین چھوٹے کمرے بناتے تھے۔ جس میں صرف دو تین آدمی آسکتے تھے، ان کمروں میں بیٹھ کر الگ الگ ذکر کرتے تھے۔ (ملفوظات حکیم العصر: ۱۳۰)

☆......حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی خانقاہ کا حال سنیے، وہ لکھتے ہیں: اس کا لحاظ ضروری ہے کہ بدعتی صورت پیدا نہ ہو۔ مثلاً یہ کہ ایک حلقہ میں سب کا ذکر نہ ہو۔ علیحدہ علیحدہ نشستیں تجویز کریں۔ اس کو آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

ایک نشست یعنی بالکل اجتماعی صورت یہاں بھی نہ ہو، مدرسہ قدیم میں جیسے متفرق لوگ کرتے رہتے ہیں، اس میں مضائقہ نہیں۔ (تربیۃ السالکین ص ۱۵۶، ۱۵۷)

معلوم ہوا ان کی خانقاہ میں لوگ متفرق بیٹھ کر ذکر کرتے تھے۔

## کتاب ''ذکر اللہ کے حلقے'' پر ایک نظر

برادران اہل السنۃ والجماعۃ!

اولاً: ہمارے پیش نظر آیت کریمہ: **وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا** (پ۶ المائدہ آیت ۸) (ترجمہ: اور کسی خاص قوم کی عداوت تمہارے لیے اس کا باعث نہ ہو جائے کہ تم عدل نہ کرو۔) ہے کہ ہم کسی کی مخالفت میں آکر ہم کسی کی مخالفت میں آکر اعتدال کا دامن چھوڑ دیں یہ بات انتہائی نامناسب ہے۔

ثانیاً: قرآن مجید میں دوسرے موقع پر ارشاد ہے: **اِنَّمَا کَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا** (پ۱۸ النور آیت ۵۱) (ترجمہ: مسلمانوں کا قول تو، جب کہ اُن کو کسی مقدمہ میں اللہ کی طرف اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے، تاکہ ان کے درمیان فیصلہ کردیں، یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں ہم نے سُن لیا اور مان لیا۔) مسلمان کی شان یہ ہے کہ جب اسے اللہ اور اس کے پیارے رسول ﷺ کے فیصلے کی طرف بلایا جائے تو وہ اسے بسر وچشم قبول کرتا ہے۔

اور دوسری جگہ ارشاد خداوندی ہے: **وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا.** (پ ۱۹/الفرقان: ۷۳) (ترجمہ: وہ ایسے ہیں کہ جس وقت اُن کو اللہ کے احکام کے ذریعے سے نصیحت کی جاتی ہے تو ان (احکام) پر بہرے، اندھے ہو کر نہیں گرتے۔) نیک بندوں کی شان یہ ہے کہ وہ خدائی احکامات کو سن کر ان سے بہرے اور اندھے نہیں ہوتے۔ اس لیے ہمیں حق بات ہی کہنی ہے۔ اور آپ لوگوں کو اس کی اتباع کی دعوت دینی ہے۔ **ان اريد الا الاصلاح ما استطعت ما توفيقى الا بالله**

اس کتاب کو دیکھنے کے بعد دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ اکابر دیوبند کے مسلک کی صحیح ترجمانی کی جائے۔ اس کی میں ایک وزنی دلیل عرض کرتا ہوں۔

قطب الارشاد فقیہ النفس حضرت مولنا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہم فرماتے ہیں عقد مجلس مولود اگرچہ اس میں کوئی امر غیر مشروع نہ ہو، مگر اہتمام و تداعی اس میں موجود ہے۔ لہٰذا اس زمانہ میں درست نہیں۔ (فتاویٰ رشادیہ ص ۱۰۵)

دوسری جگہ لکھتے ہیں: فیوض الحرمین میں حاضری مولد النبی میں کہ مکان ولادت آپ علیہ السلام کا ہی لکھا ہے۔ وہاں ہر روز زیارت کے واسطے لوگ جاتے ہیں۔ یوم ولادت میں بھی لوگ جمع تھے اور صلوٰۃ و ذکر کرتے تھے۔ نہ وہاں تداعی سے اہتمام طلب کے تھے، نہ کوئی مجلس تھی۔ بلکہ وہاں لوگ خود بخود جمع ہو کر کوئی درود پڑھتا تھا، کوئی ذکر معجزات کرتا تھا۔ الخ (فتاوٰی رشیدیہ ص ۱۰۷)

حضرت فرماتے ہیں مجلس مولود کی رسوم بدعات کے بارے میں جو کچھ مولوی خلیل احمد سلمہ نے براہین میں لکھا ہے، وہ عقیدہ بندہ کا ہے اور سب ہماری جماعت کا۔ (مکاتیب رشیدیہ ص ۷۴)

اب سنیے براہین قاطعہ کی:

☆ خود امر منصوص مباح بھی بعض اوقات بسبب اس تاکد کے مکروہ ہو جاتا ہے، جیسے صلوٰۃ ضحیٰ کہ تداعی و اہتمام سے ص ۵۶

☆ مجیب کے برادران مولود کو مندوب کہتے ہیں بشرطیکہ تداعی و اہتمام سے بھی خالی ہو ص ۶۰۔

☆ شارع نے جس کا اہتمام و تداعی کے ساتھ حکم فرمایا وہ تو اس طرح ہوئے اور جس کو مطلق فرمایا اس میں تداعی کا اضافہ نہ ہونا چاہیے۔ ورنہ تبدیل حکم شرعی و بدعت ہو جاوے گا۔ ص ۱۱۴

☆ پس غور کرنا چاہیے کہ نفس ذکر مولود مندوب و مستحسن ہے، مگر صلوٰۃ نفل اس سے اعلیٰ اور افضل ہے کہ عمدہ عبادات اور افضل القربات اور خیر موضوع ہے۔ مگر بایں ہمہ بوجہ تداعی و اہتمام کے کہ یہ اس میں

مشروع نہیں، بدعت لکھتے ہیں۔ یہاں ذکر مولود بھی گو مندوب ہے، مگر تداعی واہتمام اس کا کہ کہیں سلف سے ثابت نہیں، بدعت ہووے گا۔ البتہ وعظ ودرس میں تداعی ثابت ہے، کیوں کہ وہ فرض ہے۔ جیسا فرائض صلوات میں تداعی ضروری ہے۔ (براہین قاطعہ ص ۱۴۹، ۱۵۰)

☆ تداعی اور اہتمام اس ذکر کے واسطے بالخصوصیت مکروہ کہتے ہیں، مثل تداعی نوافل کے۔

ص ۱۷۵۔

☆ پس تقرر تاریخ اور فرش معمول اور شرینی مروج اور روشنی کثیر اور تداعی واہتمام وغیرہ اگر سب یا بعض جیسا مروج ذکر مولود کے ساتھ ہوں گے تو وہ محفل بوجہ ان قیود کے اطلاق سے نکل کر بدعت ہو جاوے گی۔ (ص ۲۵۰)

☆ حکیم الامت مجدد دین وملت الشاہ اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں:

حضرت حسنؓ سے روایت ہے کہ حضرت عثمانؓ بن ابی العاص کسی ختنہ میں بلائے گئے۔ آپ نے انکار فرما دیا۔ کسی نے دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا کہ پیغمبر خدا ﷺ کے زمانہ مبارک میں ہم لوگ ختنہ میں نہیں بلائے جاتے تھے۔ روایت کیا اس کو احمد نے معلوم ہوا کہ جس کام کے لئے لوگوں کو بلانا سنت سے ثابت نہیں اس کے لئے بلانے کو صحابیؓ نے ناپسند کیا اور جانے سے انکار کیا اور راز میں یہ ہے کہ بلانا دلیل ہے اہتمام کی، تو شریعت نے جس امر کا اہتمام نہیں کیا اس کا اہتمام کرنا دین میں ایجاد کرنا ہے اسی وجہ سے حضرت ابن عمرؓ نے لوگوں کو جب مسجد میں چاشت کی نماز کے لئے مجتمع دیکھا تو براہ انکار اس کو بدعت فرمایا اور اسی بنا پر فقہاء نے جماعت نافلہ کو مکروہ کہا ہے۔ (اصلاح الرسوم ص ۱۳۳)

☆ اکابر کے علوم کے امین فقیہ العصر مفتی عبدالشکور ترمذی صاحبؒ فرماتے ہیں:

جتنی وجوہات صلوٰۃ الرغائب کی کراہت پر شارح منیہ نے بیان کی ہیں وہ سب وجوہات ان اعراس اور محافل میلاد میں پائی جاتی ہیں ان میں تداعی اور اجتماع کا اہتمام بھی پایا جاتا ہے اور مطلق کی تقیید اور زمانہ کے ساتھ تخصیص بھی موجود ہے اور اگر زمانہ کی تخصیص نہ بھی ہو تو تداعی اور اجتماع کا اہتمام تو بہر صورت پایا جاتا ہے۔ اور اس تداعی اور اہتمام اجتماع اور دوام عمل سے فساد عقیدہ عوام کا نہ صرف احتمال بلکہ وقوع ہو رہا ہے وہ اس کو لازم سمجھتے ہیں تارک پر ملامت ولعن طعن بھی کرتے ہیں۔ قرون ثلاثہ میں اس صورت وہیئت کے ساتھ ان مجالس کا اہتمام تو کیا انعقاد بھی یقیناً ثابت نہیں تو پھر ان قواعد مقررہ مذکورہ کی روشنی میں کتاب وسنت سے مستنبط ہیں ان کے مکروہ اور بدعت ہونے میں کیا کلام ہے۔ (تحقیقی نظر ص ۳۹)

القصہ اکابر کے واضح اور دوٹوک الفاظ سے یہی مبرہن ہوتا ہے کہ مندوب ومستحسن اور مستحب

کاموں کے لئے تداعی، اجتماع، اہتمام، اشتہار و تشہیر درست نہیں اور ناجائز اور بدعت کے زمرہ میں آتا ہے۔

مگر اس کتاب میں اس کو پرزور طریقے سے ثابت کیا گیا ہے۔ مثلاً:

لکھا ہے کہ مجالس ذکر اللہ کے خلاف ایک مغالطہ تداعی ہے۔ دفاع ذکر اللہ میں اس موضوع پر اکابر نے کتابوں میں تفصیلی اور تحقیقی بحث کی ہے۔ (ذکر اللہ کے حلقے ص ۵۸)

حالانکہ اکابر دیوبند کے تفصیلی فیصلے آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ وہ تداعی کو مندوبات و مستحبات کے لئے منکر سمجھتے ہیں۔ جب کہ یہ بات ان کے مسلک پر الزام ہے۔

ہم اہل مجالس سے کیا پوچھ سکتے ہیں کہ یہ سب احادیث و دلائل اکابر اہل سنت کے سامنے تھے مگر ان حضرات نے تو کبھی بھی ان پر عمل نہ کیا تو آپ لوگ ان پر عامل ہو کر کیا اجر و ثواب میں ان سے بڑھ گئے یا نہ؟

اور ان حضرات نے اتنی صاف باتوں کو کیوں جان بوجھ کر چھوڑ دیا۔

مگر اس کتاب والے حضرات لاؤڈ سپیکر پر اجتماعی ذکر کو اور بطور ثواب کرتے ہیں اور مستحب سمجھتے ہیں اور تارکین پر ملامت کر کے اس کا التزام کرتے ہیں۔

اب چوک یا بھول یہ ہوگئی کہ ان کو جو علاجاً یا تعلیماً گنجائش سمجھتے ہیں ان کو اپنی تائید میں لا کھڑا کیا اور اس کو وہ بھول گئے کہ ثواب کے لئے مجلس منعقد کرنا یا اس کو احادیث سے ثابت کرنا یا التزام کرنا اس کو وہ بھی ناجائز قرار دیتے ہیں۔

☆ مثلاً: اسی کتاب کے ص ۴۰۴ پر لکھا ہے ان کی حیثیت علاج ہی کی ہوتی ہے شرعی عبادت کی نہیں ہوتی۔

☆ ص ۴۰۱ پر لکھا ہے کسی خاص ہیئت، وضع و تاریخ وغیرہ جن کا ثبوت شرعی نہیں ہے ان کا التزام کرنا تارک پر ملامت کرنا سبّ و شتم کرنا ریا دکا پایا جانا یا جہر مفرد کا ہونا۔۔۔۔ اگر اجتماعی ذکر ممنوعہ عوارض سے پاک ہو تو اس کو ناجائز یا بدعت کہنا زیادتی ہے۔

☆ ص ۳۹۷ پر ہے: اس کا مقصد محض علاج نفس ہے یہ طریقے کوئی شرعی چیز نہیں۔

☆ ص ۴۱۱ پر ہے: اگر کوئی شخص ذکر اللہ کے ان مخصوص طریقوں کو سنت سمجھے گا تو اس کے حق میں یہ بدعت ہوں گے مثلاً ان خاص طریقوں کو رسول اللہ ﷺ سے منقول سمجھے یا ان میں زیادہ ثواب کا قائل ہو یا اس خاص طریقہ پر عمل نہ کرنے والے کو محروم سمجھے اور اسے ملامت کرے تو اس شخص کے حق میں یہ جائز

طریقہ بدعت بن جائے گا۔

☆اب آپ صاحب کتاب کی ترتیب دیکھیں اور احادیث طیبات اور صحابہ کرامؓ سے مجالس ذکر کا ثبوت پیش فرماتے ہیں اور آنجناب کی لسان حافظ نثار احمد صاحب تو اس مجلس ذکر کو مستحب قرار دیتے ہیں۔ دیکھئے ص ۴۸

تو آپ کی مروجہ مجلس ذکر تو آپ کی کتاب سے ہی فارغ ہوگئی۔

کیونکہ فتاویٰ جات ہیں کہ ان طریقوں کو آپؐ سے منقول نہ سمجھو مگر آنجناب تو پورے زور سے اس کو ثابت فرمارہے ہیں۔ وہاں فتاویٰ جات میں ہے کہ اس کو علاج جانو نہ کہ عبادت۔ مگر آنجناب تو اس کو شرعی عبادت سمجھتے ہیں۔

☆ان فتاویٰ جات میں ہے: جہر مفرط نہ ہو مگر آنجناب اور آپ کے خدام تو جہر مفرط کرتے ہیں۔ خیر الفتاویٰ میں صاف صاف موجود ہے کہ سپیکر پر ذکر جائز نہیں۔ تفصیل یہ بھی لکھی ہے کہ ''بلند آواز سے ذکر کرنے سے کسی نمازی کو یا سوئے ہوئے کو تکلیف ہو تو ایسا کرنا جائز نہیں اور جہر مفرط ذکر ویسے بھی درست نہیں کسی کو تکلیف ہو یا نہ ہو''۔ (خیر الفتاویٰ ج ا ص ۳۵۰)

تو آپ کے طرز کو تو آپ کے مریدین بھی نادرست سمجھتے ہیں۔

فتاویٰ جات میں شرعی چیز نہ سمجھیں مگر آنجناب تو شرعی ہی فرمارہے ہیں۔ ص ۴۷ پر لکھا ہے مجالس اور حلقہ کی یہ تمام صورتیں حدیث سے ثابت ہیں۔ صحابہ کرامؓ ان تمام صورتوں کے ساتھ ذکر کرتے بھی تھے، ذکر سکھاتے بھی تھے اور ایک دوسرے کو دعوت بھی دیتے تھے۔

☆ان فتاویٰ جات میں التزام اور تارک پر ملامت نہ ہو مگر آپ کے احباب تو قابل ملامت جانتے ہیں اور کرتے بھی ہیں اور آپ نے خود بھی یہ ذرہ نوازی فرمائی ہے اور ایسے مبہم انداز میں شیطان کے ساتھ ان کو شامل فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں: اللہ جزائے خیر عطا فرمائے ذکر اللہ کے عاشقوں اور حامیوں کو کہ ہر زمانہ میں انہوں نے ذکر اللہ کا دفاع کیا اور شیطان مردود کی چالوں کو ناکام بنایا ہے۔ الخ (ص:۵۴)

☆ص: ۴۲۷ پر ہے: آخر میں ان حضرات سے جو دانستہ یا نادانستہ ذکر اللہ اور محافل ذکر اللہ کی مخالفت کا وبال اپنے سر لیے ہوئے ہیں ان سے ہمدردانہ اور خیر خواہانہ اپیل ہے کہ وہ اپنے رویے پر نظر ثانی کریں وہ یقیناً اکابر اولیاء ومشائخ سے نہ علم میں بڑے ہیں اور نہ ہی عمل میں ان کے اس طرزِ عمل سے ان کا اپنا دارین کا نقصان ہے۔

☆ص ۴۳۰ پر:

بلا شک وشبہ یہ مجالس مبارکہ جہاں جنت کے باغ ہیں تو یہ وہ قلعہ بھی ہے جس میں انسان شیطان کے حربوں سے محفوظ رہ سکتا ہے ورنہ شیطان کے ہتھے چڑھ جانا یقینی ہے۔

گویا یہ شریک ہونے والے شیطان کے ہتھے چڑھ چکے ہیں۔

تو یہ ملامت کرنا بھی ان فتاویٰ جات کو اپنے اوپر لینے والی بات ہے۔

اور اسی سے ان مجالس کو لازم سمجھنا بھی معلوم ہو گیا۔

☆......حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں: التزام اعتقادی یا عملی کو منع کیا جاتا ہے۔ التزام اعتقادی یہ ہے اس کو ضروری سمجھے اور التزام عملی یہ ہے کہ اس کے ترک پر ملامت کریں۔ (تحفۃ العلماء ص۱۰۷)

حکیم الامت مزید لکھتے ہیں کسی امر غیر ضروری کو اپنے عقیدہ میں ضروری اور مؤکد سمجھ لینا یا عمل میں ایک پابندی اصرار کے ساتھ اس طرح کرنا کہ فرائض و واجبات کی مثل یا زیادہ اس کا اہتمام ہو اور اس کے ترک کو مذموم اور تارک کو قابل ملامت وشناعت جانتا ہو یہ دونوں امر ممنوع ہیں کیونکہ اس میں حکم شرعی کو توڑ دینا ہے۔ (اصلاح الرسول ص ۱۳۵، ۱۳۶)

تیسری بات یہ ہے کہ آپ نے دلائل عمومی رکھے اور مسئلہ خاص نوعیت کا ہے، یہ طرز تو درست نہیں۔ کیوں کہ مطلق آیات وروایات کو اپنے خاص مسائل میں پیش کرنا آپ کے شایان شان نہیں، یہ طریقہ تو ہمارا نہیں۔

☆امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ لکھتے ہیں: ان عبارات سے معلوم ہوا کہ احکام عامہ سے امور خاصہ کا اثبات ہرگز صحیح نہیں۔ تاوقتیکہ ان کی تخصیص کے لیے کوئی الگ اور منتقل خاص دلیل موجود نہ ہو۔ کیوں کہ شریعت کی کسی عام دلیل کو اپنی مرضی سے خاص کرنے کا کسی کو حق حاصل نہیں۔ مطلق کو اس طرح مقید کر دینا اور عمومات کو اس طرح خصوص کے قالب میں ڈھال لینا یہی احداث فی الدین اور منصب تشریع پر دست اندازی ہے۔ (راہ سنت ص ۱۳۲)

شاید آپ کے حاشیہ خیال میں آئے کہ ایسی روایات بھی تو ہیں جن میں صراحۃً مجالس ذکر اور حِلَق ذکر ثابت ہوتا ہے۔ تو مخدوم محترم گذارش یہ ہے کہ حدیث کی تشریح حدیث کرتی ہے۔

تو چند احادیث پیش خدمت ہیں۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ کے کچھ چلنے پھرنے والے فرشتے ہیں، وہ ذکر کے حلقے تلاش کرتے ہیں۔ جب ان حلقے والوں کے پاس پہنچتے ہیں، ان کو گھیر لیتے ہیں۔ پھر اپنے ایک فرشتے کو آسمان کی طرف اللہ تعالیٰ کے پاس بھیجتے ہیں۔ تو بتاتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم آپ کے بندوں میں سے کچھ بندوں کے پاس گئے تھے۔ وہ

آپ کی نعمتوں کی عظمت بیان کر رہے تھے اور اپنی آخرت اور دنیا کے لیے مانگ رہے تھے۔ الخ

(مسند بزار حدیث نمبر ۶۴۹۴ حلیۃ الاولیاء ج ۶ ص ۲۶۸)

سیدنا ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ جب جنت کے باغوں میں سے گزرو تو خوب چرو۔ پھر فرمایا مراد قصہ گو لوگوں کی مجالس مراد نہیں بلکہ اہل فقہ کی مجالس مراد ہیں۔ (الاثار لابی یوسف ص ۹۵۹)

یعنی علمی مجالس۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا: جب تم ریاض جنت سے گزرو تو خوب چرو۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا ریاض الجنہ کیا ہیں تو فرمایا مجالس العلم یعنی علمی مجالس (طبرانی)

تو آں جناب ادھر بھی غور فرمایئے کہ مجالس ذکر اور ذکر کے حلقوں کی تشریح احادیث سے خود ہی علمی مجالس سے ہو رہی ہے نہ کہ مروجہ مجالس ذکر سے۔

چوتھی بات عرض خدمت یہ ہے اگر آں جناب کی طبع نازک پر بار نہ گزرے تو آپ سے یہ بھی تسامح یا بھول ہوئی کہ مجالس ذکر کے الفاظ سے آپ نے اپنی مروجہ مجالس ذکر مطلب سمجھا۔ حالاں کہ ایسا نہیں۔ یعنی آپ جو علماء وصوفیاء کی مجالس ذکر کی باتیں سناتے رہے کہ وہ بھی اور یہ بھی اور فلاں جگہ فلاں صاحب۔ تو میری بات کا مطلب یہ ہے کہ ان واقعات میں کتنے افراد تو وہ ہیں جو آپ کی مروجہ مجالس کو منعقد نہیں کراتے تھے، بلکہ انفرادی ذکر جو کہ شرائط کے ساتھ جائز، وہ کرتے اور کراتے تھے۔ کچھ تو ہم نے پیچھے بھی اس پر عرض کر دیا ہے، مزید کچھ عرض خدمت ہے۔

☆ آپ نے ص ۳۲۲ پر لکھا ہے حضرت صاحبزادہ صوفی محمد حسین صاحب للّہیؒ حضرت رائے پوریؒ کے غالباً آخری خلیفہ ہیں۔ گوجر خان صوبہ پنجاب میں ان کی خانقاہ ہے، ہفتہ وار مجلس ذکر کا ہمیشہ معمول رہا۔ الخ

حالاں کہ وہ خود لکھتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

مولنا محمد حسین للّہی خلیفہ مجاز حضرت اقدس رائے پوریؒ لکھتے ہیں: بعض مشائخ کو ذکر کی اجتماعی مجلس کرتے کراتے ہیں، وہ صرف مسترشدین کی تعلیم کے لیے اور ذکر کو رواں رکھنے کے لیے کراتے ہیں۔ اور اس مجلس میں ہر شخص اپنا اپنا ذکر کرتا ہے۔ کیوں کہ آواز ملا کر ذکر لاؤڈ سپیکر پر ذکر کرنے کو مشائخ نے بدعت بتلایا ہے۔ جیسا کہ شیخ ابوبکر جابر الجزائری المدنی نے لکھا ہے:

ترجمہ: یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ کتاب وسنت سے ثابت عبادت پر جب کبھی بدعت کا رنگ یا زمانے کا رنگ اس کی کمیت، کیفیت، زمان ومکان وغیرہ پر لگ جاتا ہے۔

تو پھر وہ اپنا اثر کھو دیتی ہے اور کرنے والا کسی اجر کا مستحق نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ذکر کتاب و سنت مشروع ومطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

ترجمہ: ''اے ایمان والوتم اللہ کوخوب کثرت سے یاد کرو۔''

اور جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

''جواپنے رب کا ذکر کرتا ہےاور جونہیں کرتا اس کی مثال زندہ اور مردہ کی ہے۔'' (بخاری ومسلم)

اس کے ثبوت کے باوجود بہت سے لوگوں کے یہاں اس میں بدعت کا رنگ آ گیا اور اس کو خراب کر دیا اور اس کے فوائد تزکیہ نفس، طہارت روح اور اس پر جو ثواب اور رضائے الٰہی ملتی ہے اس سے اس کو محروم کر دیا۔ کیونکہ بعض لوگ ایسے الفاظ سے ذکر کرتے ہیں اور ایک جا و یک آہنگ ہو کر لاؤڈ سپیکر پر ذکر کرتے ہیں۔

جن کا ثبوت آنحضرت ﷺ سے نہیں، نہ آپ ﷺ نے حکم دیا، نہ اجازت۔ تو عبادت ذکر ایک عظیم الشان اور فضیلت والی عبادت ہے۔ جب اس کمیت و کیفیت میں بدعت کا رنگ آ گیا تو اس کا اثر ختم اور کرنے والا اجر و ثواب سے محروم ہو گیا۔ (رسالہ المولد)

لہٰذا سب سے بڑی رکاوٹ ذکر کا اثر نہ ہونے اور وصول الی اللہ نہ ہونے میں بدعات کا ارتکاب ہے۔ بدعت ایسی بری چیز ہے کہ بڑے سے بڑے گناہ گار بلکہ مشرک و کافر تک کو توبہ کی توفیق نصیب ہو جاتی ہے۔

لیکن بدعتی کو توبہ کی توفیق کم نصیب ہوتی ہے کیونکہ وہ اس کو مستحسن اور اچھا سمجھ رہا ہوتا ہے۔ اسی لیے جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ترجمہ: ہر بدعت گمراہی ہے اور گمراہی جہنم میں لے جانے والی ہے۔ (تجلیات حق ص۱۲۳ تا ۱۲۵)

آنجناب نے بخوبی ملاحظہ فرمایا کہ وہ تو مروجہ مجالس ذکر کو جو کہ آواز کو آواز سے ملا کر کرنے اور لاؤڈ سپیکر پر ہوتی ہے بدعت کہتے ہیں۔

## چند مزید تسامحات:

آنجناب نے فخر السادات حضرت مولانا سید نفیس الحسینی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھا ہے۔ لاہور میں ان کی رہائش گاہ پر اور خانقاہ سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ میں مجلس ذکر ہوا کرتی تھی۔ ص ۳۲۳

اس فقیر کو بھی ان سے نسبت رہی ہے اور ان کی خدمت میں اکثر جانا ہوتا رہا مگر یہ معمول ہمیں دیکھنے میں نہیں ملا۔

حضرت کے حالات زندگی میں تو یہ بات درج ہے: ایک صاحب نے عرض کیا حضرت ایک مجلس ذکر کے اشتہار میں آپ کا نام لکھا ہوا دیکھا ہم نے تو اس لیے اس پروگرام میں شرکت کی کہ آپ کی زیارت ہو جائیگی لیکن آپ تشریف نہیں لائے۔ حضرت نے فرمایا جس مجلس ذکر کے اشتہار میں میرا نام لکھا ہوا دیکھو تو

سمجھ لو کہ اس میں شرکت نہیں کروں گا۔ پھر فرمایا کہ ہمارے سلسلے میں مختلف جگہوں پر مجالس ذکر کا انعقاد کروانا اور اشتہار چھپوانا وغیرہ یہ نہیں ہے۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ بھی سفر کرتے تھے، لیکن جہاں جاتے وہاں اپنے معمولات کے مطابق جو ان کے ذکر کے اوقات ہوتے ان میں ذکر کرتے، اس طرح مجالس کا انعقاد نہیں کرتے تھے۔ اور جو لوگ اس وقت ان کے ساتھ ہوتے، وہ بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر اپنا اپنا ذکر کرتے رہتے تھے۔ (مجالس نفیس ص ۲۲۲)

اس سے حضرت اقدس شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمتہ اللہ علیہ کی خانقاہ کا نقشہ بھی نظر آتا ہے اور اس فقیر کو ڈھڈیاں شریف جانے کا اتفاق ہوا وہاں حضرت شاہ عبدالجلیل صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے صاحبزادے حضرت مولانا شاہ محمد سعید صاحب کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا اور ان سے استفسار بھی کیا کہ کونسی تاریخ کو مجلس ذکر ہوتی ہے۔ تو وہ فرمانے لگے کہ کئی حضرات نے آ کر یہ مشورہ دیا کہ یہ شروع کی جائے مگر ہم نے یہی سوچا ہے کہ جو طریقہ بڑوں سے اور حضرت اقدس رائے پوری رحمتہ اللہ علیہ کے دور سے چلا آ رہا ہے انفرادی ذکر کا اسی کو برقرار رکھا جائے اسی میں خیر و برکت ہے۔

تو فقیر نے ہاتھ باندھ کر گزارش کی اس کو نہ بدلا جائے مروجہ ذکر کو ہمارے اکابرین نے ناپسند کیا ہے۔

☆ آنجناب نے ص ۲۹۹/ پر حکیم العصر حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانویؒ کو بھی پیش کیا ہے اور یہ بھی ص ۳۳۳، ۳۳۴ پر چناب نگر والوں کا مجلس ذکر کرنا پیش کیا ہے مگر زمانہ قریب کے امیر مرکزیہ حکیم العصر مولانا عبدالمجید لدھیانوی رحمتہ اللہ علیہ کا ملفوظ جو عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت والوں نے لولاک کا خاص شمارہ شائع کر کے اس کے ص ۲۲۵/ پر لکھا ہے: حضرت استاد جی فرماتے ہیں کہ آج کل تصوف کے نام پر کئی جدتیں اور بدعتیں ہمارے اندر بھی داخل ہونا شروع ہوگئی ہیں جو کہ ہمارے اکابرین کے ہاں نہیں تھیں من جملہ ان میں ایک آج کل اخبارات میں بڑے بڑے اشتہار چھپتے ہیں کہ فلاں حضرت فلاں مقام پر فلاں وقت پر تشریف لائیں گے مجلس ذکر ہوگی، مراقبہ ہوگا اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی تصویریں چھپتی ہیں، ان کی ویڈیو بنتی ہیں جب یہ خرافات ہوں گی تو روحانیت اور دلوں کی صفائی کیسے ہوگی۔

حضرت استاد جی فرماتے تھے کہ حضرت خواجہ خان محمد صاحبؒ نے صحیح اصولوں اور اکابر کی ہدایت کے مطابق خانقاہی نظام کو چلایا اس میں کوئی ایک واقعہ معلوم نہیں کہ حضرت خواجہ کے نام سے مجلس ذکر اور مراقبہ کا اشتہار چھپا ہو۔

حضرت استاد جی فرماتے ہیں کہ ہمارے کچھ اہل تصوف شاگرد ہیں اب انہوں نے مدارس کے

اجتماعات میں سپیکر میں اجتماعی ذکر کرنا شروع کر دیا ہے۔ میں نے کئی ایک مقامات پر ان کو روکا بھی ہے لیکن وہ اس کا زیادہ اثر ہی نہیں لیتے۔

☆ص ۴۰۸/ پر حضرت مولانا مفتی محمد امین اور کزئی شہید کو بھی پیش کیا ہے اور ان کے متعلق ان کے حالات میں درج ہے۔

سلاسل تصوف کے اذکار کی بھی تلقین فرماتے اور خود بھی زندگی بھر ان کا اہتمام شروع رہا شروع میں خفیف جہر کے ساتھ ذکر کرتے لیکن پھر سری ذکر پر ہی عمر بھر عمل رہا۔ ذکر خواہ سری ہو یا جہری انفراداً کو ہی ترجیح دیتے اور اجتماعی مجالس کے بارے میں کبھی تلقین کے حکمات نہیں سنے گئے۔

(سہ ماہی مجلّہ المظاہر کوہاٹ، خصوصی اشاعت بیاد محقق کبیر مولانا محمد امین اور کزئی شہیدؒ ص ۷۲)

آخری گزارش ہے اثر سیدنا ابن مسعودؓ کو مخدوش کرنے کی آپ نے سعی فرمائی آنجناب کو راہ سنت اخفاء الذکر اور شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد صدیق صاحبؒ کا رسالہ پیش نظر رکھنا تھا۔

آپ خود بھی ص ۵۷، ۲۴۲/ پر اس کے رواۃ کو ثقہ نقل فرما چکے ہیں اب امام سیوطی وغیرہ سے یہ قول فرمانا کہ یہ اثر ثابت نہیں تعجب اور حیرت اور افسوس والی بات ہے۔

ہم انہی باتوں پر اکتفا کرتے ہیں اور آپ سے یہ بھی گزارش دست بدستہ عرض کرتے ہیں کہ ہمارا مقصد صرف اور صرف مسلک اہل السنۃ دیوبند کا دفاع ہے نہ تو ہم ذکر اللہ کے مخالف ہیں اور نہ ہی ذکر جہری جو باشرائط ہو اس کے مخالف ہیں اور نہ ہی اجتماعی جو کہ صورتاً ہو۔ اور تداعی اور بصوت واحد وغیرہ سے بھی پاک ہو اور دیگر شرائط کا بھی خیال رکھا گیا ہو اس کے مخالف ہیں۔

آخر میں چند باتیں مزید عرض خدمت ہیں مفتی اعظم محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

عبادت کی مختلف قسمیں ہیں بعض انفرادی ہیں، بعض اجتماعی۔ ذکر اللہ اور روزہ وغیرہ انفرادی عبادات ہیں جن کو خلوت میں اور اخفاء کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے۔ اور نماز اور حج وغیرہ اجتماعی عبادات ہیں جن کو جماعت و اجتماع کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے۔ (تفسیر معارف القران: ۳۶۰/۱، سورہ بقرہ: ۱۴۲)

سلطان العلماء ڈاکٹر علامہ خالد محمود صاحب فرماتے ہیں:

ایک سوال: اگر یہ عمل بدعت قرار پایا ہے تو جو روایات اجتماعی حلقہ ذکر کے بارے میں ملتی ہیں ان کا محمل پھر کیا ہوگا؟

جواب: ان حلقوں میں ہر کوئی اللہ کا ذکر اپنے طور پر کرتا تھا ایک ایک کلمہ کو مل کر نہ کہتے تھے نہ ان میں کہیں ذکر بالجہر ہوتا تھا۔ یہاں ذکر اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی شان و قدرت اور رحمت و نصرت کا بیان ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک بیان کرتا ہو اور دوسرے سنتے ہوں۔

حضرت امام احمدؒ کی ایک روایت میں ایک حلقہ ذکر اسی طرح ملتا ہے: **کنا نجتمع فی حلقته فنذکر الله و کان یجلس معنا اذا ذکر هو وقع حدیثه من قلوبنا مو قعا لا یقع حدیث غیره۔** (مسند امام احمد ج ا ص ۹۰) ترجمہ: ہم اجتماعی حلقہ قائم کرتے تھے میں پس اللہ کا ہم ذکر کرتے اور اویس قرنی بھی ہمارے ساتھ بیٹھتے تھے جب آپ اللہ کا ذکر کرتے تو آپ کی باتیں ہمارے دلوں میں اس طرح اثر کرتیں کہ ایسا کسی دوسرے کے ذکر سے نہ ہوتا تھا۔

اس میں ذکر سے مراد اللہ تعالیٰ کی صفت وثناء اور شان وعظمت کا مجلس میں بیان کرنا ہے۔ صحابہؓ کا اجتماعی حلقہ یہی ہوتا تھا نہ کہ ہر ایک اونچی آواز سے ذکر کرے۔ (مطالعہ بریلویت: ۳۸/۶)

حکیم الامت حضرت تھانویؒ ذکر کے حلقے اور مجمع کی تشریح میں لکھتے ہیں یعنی وہ مجالس جہاں خدا اور رسول ﷺ کا ذکر ہو رہا ہو۔ وعظ ہو رہا ہو، سیرت بیان ہو رہی ہو، حدیث کا درس ہو رہا ہو۔

(حیوۃ المسلمین: ۱۴۴)

علامہ صاحب کی تائید میں چند روایات مزید عرض خدمت ہیں:

حضرت سیدنا جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی پاک ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا: لوگو بے شک اللہ تعالیٰ کے فرشتے قافلے کی صورت میں سیر کرتے ہیں اور ذکر اللہ کی مجالس میں ٹھہرتے ہیں۔ لہٰذا جنت کی کیاریوں میں سے کچھ نہ کچھ چن لیا کرو۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ جنت کی کیاریاں کدھر ہیں تو فرمایا ذکر کی محفلیں۔ لہٰذا صبح وشام اللہ تعالیٰ کے ذکر میں گزارو اور اسے اپنے دل میں یاد کیا کرو۔

**(مسند ابو یعلی ج ۲ ص ۳۱۷ بحوالہ المتجر الرابح فی ثواب العمل الصالح)**

علامہ دمیاطیؒ نے ایک اور روایت بھی نقل کی ہے: سیدنا عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کی نبی پاک ﷺ حضرت سیدنا عبداللہ بن رواحہؓ کی پاس سے گزرے تو وہ صحابہ کرامؓ کو وعظ فرما رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم ہی وہ لوگ ہو جن کے ساتھ میرے رب عزوجل نے مجھے صبر کرنے کا حکم دیا۔

**(المتجر الرابح)**

حکیم الامت مجدد دین وملت الشاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں: اللہ کے ذکر سے یہی مراد نہیں کہ اللہ اللہ کرے بلکہ ہر قسم کی اطاعت اور فرمانبرداری مراد ہے۔ چنانچہ حصن حصین جو حدیث کی ایک کتاب ہے اس میں لکھا ہے کہ کل مطیع اللہ فھو ذاکر یعنی ہر اطاعت اللہ کا ذکر ہے۔ یہاں تک کہ خدا تعالیٰ کے حکم بجا لانے کے لیے کھانا بھی کھائے تو وہ بھی ذکر ہے۔ بلکہ بیوی کے پاس جانے میں بھی اگر دین کی پابندی مقصود ہو تو وہ بھی ذکر ہے۔ اور راز اس میں یہ ہے کہ ذکر کے معنی یاد کرنے کے ہیں اور اس کی علامت یہ ہے کہ جو کام بھی ہو اس کی مرضی کے موافق ہو جس کو یاد کرنے کا تم دعویٰ کرتے ہو۔ پس ذکر صرف اسی کو نہیں کہتے کہ

تسبیح لے کر بیٹھے۔اگر کوئی پانچ وقت کی نماز پڑھ لے،روزہ رکھا کرے اور زکوٰۃ ادا کرتا رہے اور حج فرض ہو تو وہ بھی کر لے تو یہ خدا تعالیٰ کا ذکر ہے۔چاہے ایک تسبیح بھی نہ پڑھے۔یہ دوسری بات ہے کہ تسبیح کو جو خاص برکتیں ہیں ان سے محروم رہے گا لیکن نجات میں ذرا کمی نہ ہوگی ہاں یہ شرط ہے کہ گناہوں سے بچتا رہے اور جو شخص صرف فرض واجب ادا کرے اور جس کام کی ممانعت ہے اس سے بچے،وہ خدا کا مقبول ہے۔اس کو نہ قبر میں تکلیف ہوگی نہ قیامت میں عذاب ہوگا۔تو حقیقت ذکر کی دینداری ہے اور وہ تسبیح پر موقوف نہیں۔
(تسہیل المواعظ ج ۲ ص ۳۸۷)

علامہ محمد بن طاہر پٹنیؒ لکھتے ہیں: **الذکر یشمل العند قرائة القرآن و الحدیث و تدریس العلوم و مناظرة العلماء.** (مجمع بحار الانوار ج ۲ ص ۲۴۵) مادہ ''ذکر''،یعنی ذکر میں نماز، تلاوت قرآن وحدیث اا ور علوم کا پڑھانا اور علماء کا مناظرہ کرنا سب کچھ شامل ہے۔

اور امام ابن رجب حنبلیؒ لکھتے ہیں:

**والذکر المطلق یدخل فیه الصلوٰة و تلاوة القران و تعلمه و تعلیمه و العلم النافع کما یدخل فیه التسبیح و التکبیر و التهلیل** (جامع العلوم والحکم ص ۵۶۸) مطلق ذکر میں نماز،تلاوت قرآن،اس کا سیکھنا،سکھانا اور علم نافع داخل ہے جیسا کہ تسبیح و تکبیر و تہلیل داخل ہے۔

حکیم الامت مجدد دین وملت الشاہ اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ اجل عارف باللہ ڈاکٹر عبدالحیء عارفیؒ فرماتے ہیں: ذکر اللہ کی مختلف صورتیں ہیں صرف اذکار و تسبیحات نہیں بلکہ تمام عبادات واطاعات اور معاشرات ومعاملات بھی جو شریعت وسنت کے مطابق ہوں اس میں شامل ہیں۔(اسلام اور روحانیت:۱۶)

پیران پیر روشن ضمیر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے **فاذکرونی** کی تفسیر میں سیدنا عبداللہ بن عباسؓ، حضرت سعید بن جبیر اور فضیل بن عیاضؒ کے اقوال کو پیش کیا ہے کہ **فاذکرونی بطاعتی**۔یعنی مجھے یاد کرو میری اطاعت وفرمانبرداری سے اور پھر آگے حدیث شریف بھی نقل فرمائی ہے: **قال النبی ﷺ من اطاع الله فقد ذکر الله و ان قلت صلاة و صیامة و تلاوة القرآن و من عصی الله فقد نسی و ان کثرت صلاة و صیامه و تلاوته القرآن.** (غنیۃ الطالبین ج ۲ ص ۶۸،۶۹) آپ ﷺ نے فرمایا جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی پس اس نے اللہ کو یاد کیا اگرچہ اس کی نماز،روزہ،تلاوت قرآن کم ہو اور جس نے اللہ کریم کی نافرمانی کی پس وہ خدا کو بھول گیا اگرچہ اس کی نماز،روزہ،تلاوت قرآن زیادہ ہو۔

اور آگے حضرت شیخ نے مختلف اشیاء کو ذکر کی مد میں شمار کیا ہے مثلاً نماز،قرآن، وعظ، رسول پاک ﷺ کی ذات گرامی،توبہ،جمعہ،اطاعت،ندامت،تکبیر وغیرہ۔دیکھئے **(الغنیة لطالبین طریق الحق عزوجل ج ۲ ص ۸۳)**

☆عارف باللہ ڈاکٹر عبد الحیء عارفیؒ کے ارشد خلیفہ شیخ الحدیث مولانا نذیر احمدؒ فرماتے ہیں: مناسب معلوم ہوتا ہے اس سلسلہ میں صحابہ کرامؓ کا مزاج ایک حنفی ہی کے حوالہ سے پیش کردیا جائے۔

مشکوۃ شریف باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ فصل ثالث کی ایک حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے صحابہؓ کی اتباع کی ترغیب دیتے ہوئے ان کے چند اوصاف بیان فرماتے ہیں ان ہی میں یہ بات بھی فرمائی ہے اقلھم تکلفا کہ ان میں تکلف بہت کم تھا۔ ملا علی قاریؒ نے اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے زندگی کے مختلف شعبوں میں صحابہؓ کی سادگی و بےتکلفی کا نقشہ کھینچا ہے ویسے یہ سارا کا سارا حصہ ہی آب زر سے لکھنے کے قابل ہے...... چنانچہ فرماتے ہیں: نہ ہی وہ جادو منتر کیا کرتے تھے نہ تو وہ گانے بجانے کیلیے جمع ہوا کرتے اور نہ ہی گھروں میں یا مسجدوں میں بلند آواز کے ساتھ ذکر واذکار اور درود پڑھنے کے حلقے بنایا کرتے تھے۔ (اشرف التوضیح: ۲/۸۷)

☆حلانکہ آپ کی کتاب میں آپ کے خلیفہ مجاز فرماتے ہیں: مجالس وحلقہ کی یہ تمام صورتیں حدیث سے ثابت ہیں صحابہ کرامؓ ان تمام صورتوں کے ساتھ ذکر بھی کرتے تھے۔ الخ ص ۴۷

تو ملا علی قاری سے زیادہ صحابہ کرامؓ کی زندگی آپ کے خلفاء کو معلوم ہوگی وہ تو انکاری ہیں اور یہ مصرو مقر ہیں۔ یہ استدلال امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خانؒ نے بھی حکم الذکر بالجہر میں کیا ہے۔

ہم اس سلسلہ طولانی کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور آخر میں ایک بیش قیمت اور انتہائی مفید حوالہ آپ کی نذر ہے۔

مفتی اعظم ہند مفتی عزیز الرحمنؒ نقشبندیؒ لکھتے ہیں: قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا طریق نیا اور نہایت عجیب و پراثر تھا بہت سی رسوم مروجہ کو مٹایا اور بہت سنن مخفیہ کو ظاہر فرمایا۔ شریعت اور طریقت کی تجدید فرمائی اس آخری زمانہ میں مدار ہدایت وارشاد آپ کی ذات بابرکات تھی احقر کو ایک بار بوقت حاضری سرہند یہ امر قلب پر وارد ہوا کہ حضرت قدس سرہ قطب ارشاد ہیں اور اس وقت سلوک طریقہ مرضیہ ومقبولہ رسول اللہ ﷺ آپ کا طریقہ ہے اور یہ کہ آپ مجدد ہیں۔ احقر نے اس اپنے خیال کو حضرت مولانا الحاج الحافظ خلیل احمد صاحب دامت برکاتہم خلیفہ خاص حضرت مولانا قدس سرہ کی خدمت میں بھی عرض کیا تو حضرت مولانا نے موصوف اس کی تصدیق فرمائی۔ (تذکرۃ الرشید ج۲ص۲۶)

اب میں ان کے معمولات زندگی کو سامنے رکھ دیتا ہوں تو دیکھ لیا جائے ان کا طرز کیا تھا۔

آن غواص بحر حقیقت آن صدف لا لی طریقت وشریعت عامل محدث وفقیہ کامل زین عصرہ فخر و زہرہ قطب الارشاد سالک مناہج الرشاد مرشد رشید ذی راے سدید حجتہ اللہ فی الارض مقبول بارگاہ احد حضرت مولانا الحاج الحافظ رشید احمد گنگوہی اعلی اللہ درجاتہ فی علیین۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب قدس سرہ کا علم وعمل وزہد وتقویٰ وتوکل وصبر ورضا وتسلیم بما یجزی بہ القضاء اس درجہ کے تھے کہ اس کا بیان احصاء سے باہر ہے۔ تمام عمر ایسی استقامت میں گزاری کہ سفر وحضر میں برابر اوقات شب وروز کو مشغول طاعت حق تعالیٰ رکھتے تھے۔ مجلس ان کی پر انوار تھی ظاہری وباطنی اہل علم نکات علمیہ سے مستفید ہوتے تھے اور اہل حال نور اور سکینہ قلبی حاصل کرتے تھے۔ بیس بائیس برس سے احقر کو اتفاق حاضری دربار گہربار حضرت مولانا قدس سرہ ہوتا تھا کسی وقت ذرہ برابر کسی مشغلہ میں فرق نہیں دیکھا۔ جو اوقات جس شغل کے تھے ان کو برابر ان ہی مشاغل میں مصروف رکھتے تھے۔ اس زمانہ میں ایسا جامع شریعت وطریقت منبع علم وعمل زمانہ کی آنکھ نے نہ دیکھا نہ سنا۔ علم حقائق میں بے نظیر اتباع سنت میں بے مثل تھے۔ ہمیشہ دوپہر کو ۱۲ بجے کے بعد ایک بجے تک قیلولہ فرماتے تھے۔ ایک بجے جس وقت ظہر کی اذان ہوتی تھی فوراً بیدار ہوجاتے تھے اور ظہر کی نماز کا سامان فرماتے۔ اکثر ظہر سے پہلے غسل فرماکر سنتیں ظہر کی حجرہ شریفہ میں پڑھ کر مشغول ذکر وتسبیح رہتے تھے۔ جب وقت جماعت کا ہوتا مسجد میں تشریف لاکر امامت ظہر کی فرماتے بعد ادائے فرض ظہر سنتین حجرہ میں آکر ادا فرماتے۔ دو سنت موکدہ، دو نفل اس کے بعد کھڑے ہوکر بعد ادائے سنن معمولی وظائف مشروعہ تلاوت قرآن شریف میں مشغول ہوتے۔ تلاوت سے فارغ ہوکر تسبیح وتہلیل لسانی میں مشغول رہتے تھے۔ اس وقت میں جو بھی مہمان وخدام موجود ہوتے تھے خدمت شریف میں حاضر ہوکر استفادہ مسائل شریعت وجمیعت باطنیہ کرتے تھے لیکن باوجود اس کے جواب مسائل بھی دیتے تھے اور ضروری باتیں بھی فرماتے تھے لیکن مراقبہ وذکر لسانی میں برابر مشغول رہتے تھے اور چہرہ پر انوار سے کیفیت استغراق وحضوری نمایاں ہوتی تھی اسی مشغولی میں جب وقت عصر آجاتا وضو جدید فرماکر مسجد میں تشریف لاکر دو رکعت نفل ادا فرماتے پھر امامت عصر فرماکر اکثر اوقات حجرہ سے باہر تشریف رکھتے تھے اس وقت خدام وحاضرین کا مجمع ہوتا تھا۔ اہل شہر اس وقت حاضر خدمت ہوتے تھے اور مہمانان ومریدین عموماً اس وقت حاضر خدمت رہتے تھے۔ علماء جو حاضر خدمت ہوتے تھے وہ اس وقت سوالات بھی کرتے تھے اور حضرت قدس سرہ ہر ایک سوال کا جواب تحقیقی دیتے تھے۔ مغرب تک اسی طرح تشریف رکھتے تھے لیکن اس وقت بھی برابر درود ذکر لسانی جاری رہتا تھا۔ اذان مغرب کے ہونے کے بعد مسجد میں تشریف لاکر امامت مغرب فرماتے اور بعد نماز سنن ونوافل اوّابین مسجد میں ادا فرماکر دیر تک مراقب ومشغول رہتے تھے اور ادعیہ مسنونہ واوراد مشروعہ سے فارغ ہوکر پھر کچھ دیر حجرہ میں یا باہر حجرہ سے تشریف رکھ کر مکان کو تشریف لے جاتے کھانا تناول فرماکر قبل از عشاء تشریف لاکر وضو فرماکر مسجد میں تشریف لاتے تھے اور دو رکعت نفل ادا فرماکر امامت عشاء فرماتے اور سنن و وتر مسجد میں ادا فرماکر حجرہ میں آکر مشغول رہتے تھے۔ عشاء کی نماز ہمیشہ دیر میں وقت مسنون کے مطابق پڑھتے تھے۔ پھر بعد عشاء اوراد وظائف سے فارغ ہوکر استراحت فرماتے۔ بعد نصف شب کے جب

ایک ثلث شب تقریباً باقی رہتی اٹھ کر تہجد ادا فرما کر تلاوت قرآن مجید صبح صادق تک فرماتے۔ حسب ارشاد حق تعالیٰ وَ قُرْآنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْھُوْدًا اس وقت تلاوت قرآن مجید حفظ سے فرماتے تھے۔ صبح صادق کے ہونے کے بعد سنتیں پڑھ کر حجرہ شریف میں مشغول رہتے تھے۔ جب وقت جماعت صبح کا حسب مذہب امام ابوحنیفہؒ ہوتا تھا یعنی جس وقت خوب اسفار ہو جاتا نماز صبح کی امامت مسجد میں آ کر فرماتے اور بعد نماز صبح حجرہ میں تشریف رکھتے اور اتفاع شمس تک خلوت میں رہتے تھے۔ بعد نماز اشراق حجرہ کھلتا تھا اور مستفیدین حاضر خدمت ہو کر انوار شریعت وطریقت سے مستفید ہوتے تھے۔ دس گیارہ بجے دن کے طعام تناول فرما کر بعد ۱۱ بجے دن کے قیلولہ فرما کر حسب دستور وظائف طاعت میں مشغول ہوتے تھے۔ یہ ہی مختصر طریق سے بیان آنحضرت قدس سرہ کے مشغولی طاعت وعبادت کا پھر اس مشغولی میں کسی حال میں فرق نہ آتا تھا۔ جناب مولانا محمد منیر صاحب نانوتویؒ فرماتے تھے کہ میں سفر حجاز میں ہم رکاب حضرت مولانا قدس سرہ تھا۔ ایک روز جہاز میں تہجد کے وقت آپ کو ضرورت غسل کی تھی۔ مجھ سے فرمایا کہ دریا میں سے ایک دو ڈول کھینچ دو کہ غسل کروں۔ میں نے کہا کہ ابھی بہت رات ہے صبح ہونے دیجئے سفر میں اگر ایک روز تہجد قضا ہو جائے گا تو مضائقہ نہیں مگر حضرت کو یہ منظور نہیں ہوا اسی وقت غسل فرما کر نماز تہجد ادا فرمائی اور حسب معمول وظائف میں مصروف ہوئے۔

اوائل میں باوجود ان مسائل مذکورہ کے درس حدیث شریف نہایت تحقیق وتدقیق سے فرماتے تھے۔ بعد نماز اشراق دس گیارہ بجے تک اور بعد نماز ظہر وظائف وتلاوۃ قرآن شریف عصر تک اسباق حدیث کا درس فرماتے تھے۔ صدہا بلکہ ہزارہا طالبان علم دین آپ سے مستفید ہو کر ہدایت خلق اللہ میں مصروف ہوئے۔ (تذکرۃ الرشید ج ۲ ص ۲۰ تا ۲۲)

اب ہم سب کو اپنی خانقاہی مصروفیات کو قطب العالم قطب الارشاد کے نورانی آئینہ کے مطابق بنانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

شائد آپ فرمائیں کہ وہ آپ کے مزاج مروجہ کے بھی تو خلاف نہیں تو ہم عرض کرتے ہیں اگر طبع نازک پر گراں نہ ہو۔

☆ آنجناب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے: ایک بزرگ ۲۵ سال تک ہر تراویح کے بعد پورے مجمعے کو اجتماعی ذکر جہری کرواتے تھے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے اپنی کتاب ذکر اللہ کے حلقے کا صفحہ: ۲۸۴

☆ اب آپ قطب الارشاد کا ارشاد گرامی بھی اس کے متعلق سن لیں۔ جبکہ قطب الارشاد فقیہہ النفس محدث گنگوہی حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہ سے سوال ہوا کہ: رمضان شریف کی نماز تراویح میں مسجد کے اندر بعد ادائے چار رکعت وتسبیح معمول اور دعا کے اگر تمام مصلی متفق ہو کر بہ نیت رونق وکیفیت و

شوکت مدی ذکر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ بہ آواز بلند کریں تو جائز ہے یا نہیں؟

جواب: اس طرح ذکر کرنا بعد جلسہ تراویح کے صحابہؓ و تابعین سے منقول نہیں لہٰذا یہ ہیئت بدعت ہے (جیسا کہ کہا ہے واقعات میں کہ الحمد اللہ کا پڑھنا فرائض کے بعد مہمات وغیرہ کی وجہ سے مکروہ ہے کیونکہ بدعت ہے۔ صحابہؓ اور تابعین سے منقول نہیں ہوا) **کما قال فی الواقعات قرائۃ الفاتحہ بعد المکتوبہ لاجل المہمات و غیرھا مکروہ لانہا بدعتہ لم ینقل من الصحابہ و التابعین انتھی** اور بحرالرائق میں روایت ہے۔ (حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے لوگوں کو مسجد میں بآواز بلند تہلیل کرتے اور درود شریف پڑھتے سنا تو ان کی جانب گئے اور فرمایا کہ زمانہ سرور عالم ﷺ میں ہم نے ایسا نہیں کیا اور میں تو تمہیں بدعتی سمجھتا ہوں) **عن ابن مسعودؓ سمع قوماً اجتمعوا فی المسجد یھللون و یصلون علی النبی ﷺ جھراً فراح الیھم فقال ما عھدنا ذلک فی عھدہ ﷺ وما اراکم الامبتد عین الخ**

ان دونوں سند سے دریافت ہوا کہ اگر چہ ذکر مطلقا جائز ہے مگر جس موقع پر کوئی طرز خاص قرون ثلاثہ میں پایا گیا اس کو بدلنا بدعت ہے۔ پس ہر چند کلمہ طیبہ جہراً جائز ہے اپنے موقع جواز پر مگر جلسہ تراویح میں اس طرح ثبوت نہیں تو اس طرح کرنا بدعت ہوگا۔ لہٰذا عوام اس کو سنت سمجھ جاوینگے اور جس مباح کو عوام (حاشیہ تذکرہ الرشید) سنت جانیں وہ بدعت ہو جاتا ہے۔

۳؎ **قال فی العالمگیر یہ ما یفعل عقیب الصلوۃ مکروہ لان الجھال یعتقدونہ سنتہ او واجبتہ و کل مباح یودی الیہ مکروہ کذافی الزاھدی۔** بہر حال ذکر اس طرح کرنا بدعت ہے۔ اگر چہ نفس کلمہ طیبہ کا جہر سے درست ہے مگر موقع پر کہ خیر القرون میں اس ہیئت سے ثابت نہیں ہوا بلکہ یہ محل اخفاء کا ہے لہٰذا بدعت ہوا۔ اور نیز اس میں فساد عقیدہ عوام کا ہے۔ فقط واللہ اعلم۔

(تذکرہ الرشید ج ا ص ۱۷۰) حاشیہ تذکرہ الرشید

۳؎ کہا ہے عالمگیریہ میں: جو کچھ (سنت سے زائد) کیا جاتا ہے نماز کے بعد وہ سب مکروہ ہے کیونکہ انجان آدمی اس کو سنت یا واجب ہونے کا اعتقاد کرنے لگتے ہیں اور (یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ) ہر مباح جو یہاں تک پہنچائے وہ مکروہ ہے ایسا ہی زاہدی میں ہے۔ (حاشیہ تذکرہ الرشید ج ا ص ۱۷۰)

اب میری آنجناب سے گذارش ہے کہ ان سنہری نقوش کو دیکھیں اور اپنے لئے حرز جان بنائیں اور اپنی خانقاہوں کو حضرت قطب الارشاد کے قول و فعل کے مطابق ڈھالنے کی سعی فرمائیں۔ **واللہ الموفق و المعین**

☆......☆......☆......☆

بہ سلسلہ زبیر علی زئی کا تعاقب

مفتی رب نواز حفظہ اللہ

# علی زئی جواب پر ایک نظر

قسط: ۹

## زبیر علی زئی:

حدیث کی دو قسمیں:

۱: بعض احادیث کے صحیح یا ضعیف ہونے پر محدثین کرام کا اتفاق یعنی اجماع ہے۔ ۵۴۳

۲: بعض احادیث کے صحیح یا ضعیف ہونے پر محدثین کرام کا اختلاف ہے۔ ۵۴۴

اختلاف کی صورت میں اصول حدیث اور تقدیم الجمہور فی اسماء الرجال کو مدنظر رکھتے ہوئے فیصلہ کیا جاتا ہے اور مرجوح کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ۵۴۵

یہاں اصول مذکورہ کو مقدم کرنے والا مصیب اور دوسرا مخطی ہوتا ہے۔ ۵۴۶

بعض روایات کے صحیح یا ضعیف ہونے میں علمائے حدیث میں اختلاف رہا ہے۔ مثلاً

۱: میت کو غسل دینے سے غسل کرنے والی حدیث کو ترمذی (۹۹۳) حسن اور ابن حبان (الاحسان: ۱۱۵۸) نے صحیح قرار دیا ہے، جب کہ نووی نے کہا: ''بل ھو ضعیف'' بلکہ وہ ضعیف ہے۔ ۵۴۷ (المجموع شرح المہذب ۱۸۵/۵)

امام احمد بن حنبل نے فرمایا: ''لیس فیہ حدیث یثبت'' اس میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہوتی۔ (مسائل احمد روایۃ عبداللہ بن احمد ۷۹/۱ رقم ۸۷)

امام ابن المنذر نے فرمایا: اور اس میں کوئی روایت بھی ثابت نہیں۔

(الاوسط ۳۵۱/۵ ث ۲۹۶۸)

۲: حاکم نے ایک روایت کو ''صحیح الاسناد'' کہا تو حافظ ذہبی نے رد کیا:

''بل ضعیف'' بلکہ (یہ روایت) ضعیف ہے۔ (المستدرک و تلخیصہ ۶۰/۲ ح ۲۳۵۴)

نیز دیکھئے المستدرک و تلخیصہ (۳۹۲/۲ ح ۳۴۸۰، ۱۵۲/۳، ح ۴۷۲۶)

**محدثین کرام اور آل دیوبند:**

آلِ دیوبند نے بھی کئی مقامات پر محدثین کرام کے ساتھ اختلاف کر رکھا ہے۔ مثلاً: ۵۴۸

## الجواب:

### ۵۴۳

(الف)۔ بعض احادیث کی صحت پر محدثین کا اتفاق تو ہے مگر جو لوگ اجماع کو حجت نہیں سمجھتے

انہیں کیسے مطمئن کریں گے؟ غیر مقلدین کی طرف سے اجماع کی عدم حجیت پر متعدد حوالہ جات ہم پیچھے نقل کر چکے ہیں۔ کبھی ایسے لوگوں سے علی زئی کا واسطہ بھی پڑ جاتا تھا۔

محمد رفیق طاہر غیر مقلد (مدرس جامعہ محمدیہ گوجرانوالہ) علی زئی کے حالات میں لکھتے ہیں:

''ایک مرتبہ میں نے شیخ صاحب سے اجازۃ الروایۃ کا مطالبہ کیا تو فرمانے لگے کہ میرا اُصول ہے کہ جو شخص میرے منہج پر نہیں، میں اسے اجازت نہیں دیتا۔ میں نے پوچھا: کون سا منہج؟ تو فرمانے لگے کہ یہی جس پہ آپ اختلاف رکھتے ہو، یعنی حجیتِ اجماع اور فہم سلف کی حجیت۔ اور مسئلہ تدلیس میں بھی گو کہ آپ کا میلان ہماری طرف ہے، لیکن کلی طور پر نہیں۔ میں نے عرض کیا: چلو مجھے نہ سہی لیکن جو لوگ اجماع کو حجت مانتے ہیں انہیں تو آپ اجازۃ الروایۃ دیں گے ناں؟ مسکرا کر فرمانے لگے ہاں جو ہمارے منہج پر ہوگا اسے ہم اجازۃ الروایۃ دیں گے۔'' [اشاعۃ الحدیث، اشاعتِ خاص بیاد زبیر علی زئی: ۴۶۳]

علی زئی کو اعتراف ہے کہ بخاری و مسلم کی حدیثیں باتفاق محدثین صحیح ہیں اور یہ بھی اقرار کرتے ہیں کہ غیر مقلدین کے ''امام المحدثین'' شیخ البانی نے بخاری مسلم کی متعدد حدیثوں کو ضعیف کہا ہے۔ یہاں علی زئی سے کیا گیا مکالمہ پڑھیں۔

آدمی: ''البانی صاحب کے بارے میں مَیں نے سنا ہے کہ انہوں نے صحیح مسلم کی بارہ روایتوں کے ساتھ اختلاف کیا ہے۔''

علی زئی: ''تیس سے اوپر ضعیف قرار دیا ہے انہوں نے۔''

آدمی: ''لیکن بعد میں رجوع کیا ہے انہوں نے؟''

علی زئی: ''نہیں کیا، وہ مرتے مرتے بھی امام بخاری کی جو صحیح بخاری ہے اس کی کئی روایتوں کو ضعیف قرار دیا ہے۔''

آدمی: اس کی وجہ کیا تھی؟''

علی زئی: منہج کی غلطی ہے، خامی ہے...'' (زبیر علی زئی کا ویڈیو کلپ)

## ۵۴۴

غیر مقلد لوگ ائمہ فقہاء کے اختلاف کو اُچھالا کرتے ہیں کہ ان کی پیروی کرو گے تو اتحاد نہیں ہو سکتا۔ اب محدثین کے اختلاف کو بھی بیان کر دیا ہے۔ صاف ظاہر ہے جب محدثین میں اختلاف ہے کہ بعض محدثین کسی حدیث کو صحیح کو کہتے ہیں اور بعض اسی کو ضعیف تو محدثین کی پیروی کرنے والے بھی مختلف ہو جائیں

گے۔ایک ہی حدیث کو کوئی شخص بعض محدثین کی پیروی میں صحیح مان کر عمل کرے گا اور دوسرا اسی کو دیگر محدثین کی اتباع میں ضعیف سمجھ کر ترک کر دے گا۔

غیر مقلدین نے فقہاء کے اختلاف کو حل کرنے کے لیے فان تنازعتم فی شئ فردوا الی الله والرسول ،اگر تمہارا کسی چیز میں جھگڑا ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو' ضابطہ پیش کیا تو کیا محدثین کے اختلاف کو حل کرنے کے لئے بھی یہی معیار قرار دیں گے؟

**۵۴۵**

(الف)-محمد جونا گڑھی غیر مقلد لکھتے ہیں:

''سنئے جناب! بزرگوں کی، مجتہدوں اور اماموں کی رائے، قیاس، اجتہاد و استنباط اور ان کے اقوال تو کہاں؟ شریعت اسلام میں تو خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی طرف سے بغیر وحی الٰہی کے کچھ فرمائیں تو وہ بھی حجت نہیں۔'' [طریق محمدی: ۷۰ طبع اہلِ حدیث اکیڈمی مئوناتھ بھنجن یوپی]

اس کتاب پر تقریظ صفی الرحمٰن مبارک پوری غیر مقلد کی ہے۔

آلِ غیر مقلدیت غیر وحی کو حجت نہیں سمجھتے یہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے بھی حجت نہیں مانتے تو وہ حدیث کی تصحیح و تضعیف میں جمہور کی بات کس دلیل سے قبول کریں گے؟

(ب)-صدیق رضا غیر مقلد نے ایک مضمون ''اتباع اور تقلید میں فرق'' لکھا اور علی زئی کی تصدیق و اتفاق سے ماہ نامہ رسالہ الحدیث میں شائع ہوا۔اس میں تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع جائز ہے اور اماموں کی تقلید جائز نہیں۔پھر بزعم خود اتباع نبی اور تقلید امام پر درج ذیل فرق بیان کئے۔

-اتباع نبی میں اللہ تعالیٰ کی مغفرت کی ضمانت ہے۔جب کہ امام کی تقلید میں یہ چیز نہیں۔

-رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اطاعتِ الٰہی ہے اور جب کہ امام کی پیروی اطاعت الٰہی نہیں ہے۔

-رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی پر دردناک عذاب ہے جب کہ امام کی نافرمانی پر یہ وعید نہیں۔

-رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب کچھ وحی سے فرماتے ہیں جب کہ امام رائے و قیاس بھی پیش کرتے ہیں۔

[مقالات الحدیث: ۸۶ تا ۱۰۹]

اس کا حاصل یہ ہوا کہ جس کی پیروی میں مغفرت کی ضمانت نہ ہو، اس کی اطاعت اطاعتِ الٰہی نہ ہو، اس کی نافرمانی پر وعید نہ ہو اور جو رائے قیاس پیش کرے اس کی بات علی زئی وغیرہ آلِ غیر مقلدیت کے

نزدیک حجت نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ علی زئی صاحب حدیث کی تصحیح وتضعیف میں جمہور محدثین کی بات کو حجت ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں تو کیا ان جمہور محدثین کی پیروی پر مغفرت کی ضمانت ہے؟، ان کی اطاعت اطاعتِ الٰہی ہے؟، ان کی نافرمانی پر دردناک عذاب کی وعید ہے؟ اور وہ رائے وقیاس پیش نہیں کرتے؟ کیا وہ وحی آسمانی سے کسی حدیث کو صحیح اور کسی کو ضعیف کہتے ہیں؟

(ج)-علی زئی صاحب تو جمہور کی پیروی پر اُبھار رہے مگر دیگر کئی غیر مقلدین نے جمہور سے اختلاف کر رکھا ہے اور بعضے جمہور سے اختلاف کرنے میں مزا محسوس کرتے ہیں۔

علی زئی صاحب نے صحیح مسلم: ۱/۱۷۴ کی حدیث واذا قرأ فانصتوا کے متعلق لکھا:

''صحیح مسلم کی اس حدیث کو جمہور علماء ومحدثین صحیح وثابت سمجھتے ہیں۔'' [علمی مقالات: ۲/۲۳۶]

جمہور علماء ومحدثین کے برعکس عبد الرحمٰن مبارک پوری سے لے کر ارشاد الحق اثری اور ان کے شاگرد خبیب اثری تک کے غیر مقلدین اس حدیث مسلم کو ضعیف کہتے ہیں۔

علی زئی صاحب اپنے مخالف کو جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''راقم الحروف کے خلاف ظہور احمد کی طرف سے اہلِ حدیث علماء کے جتنے اقوال پیش کئے گئے ہیں، وہ جمہور محدثین کی تحقیق راجح ہونے کی وجہ سے صحیح نہیں۔'' [علمی مقالات: ۶/۵۲۷]

علی زئی صاحب نے اپنے دفاع میں اہلِ حدیث علماء کو جمہور محدثین کا مخالف قرار دے دیا ہے۔

عمر فاروق قدوسی صاحب غیر مقلد (نائب مدیر مکتبہ قدوسیہ لاہور) لکھتے ہیں:

''جمہور سے اختلاف کا اپنا مزا ہے۔ ہمارے ممدوح شیخ زبیر رحمۃ اللہ علیہ بھی چند مسائل میں شاذ موقف رکھتے تھے۔'' [اشاعۃ الحدیث، اشاعتِ خاص بیاد زبیر علی زئی: ۵۳۹]

(د)-خود علی زئی صاحب آلِ غیر مقلدیت کے اعتراف کے مطابق کئی مقامات پر اصول حدیث اور اسماء الرجال میں جمہور محدثین سے اختلاف کیا کرتے ہیں۔ ثبوت ملاحظہ ہوں۔

محمد عزیز شمس غیر مقلد لکھتے ہیں:

''احادیث کی تحقیق کے سلسلے میں انہوں نے بعض ایسے اصول اپنائے ہیں جو جمہور محدثین کے خلاف ہیں۔ جیسے احادیث پر حکم لگانے میں ظاہر سند کا اعتبار اور علل کی پرواہ نہ کرنا، راویوں پر جرح وتعدیل میں علماء ونقاد کی تعداد سامنے رکھنا، صحیح کے باہر ہر مدلس راوی کا عنعنہ ناقابل قبول بتانا، معروف کتب حدیث و رجال (جو مختلف قرائن کے بنا پر ان کے مؤلفین سے ثابت ہیں) کے لیے ان کے مؤلفین تک صحیح سند کا

مطالبہ کرنا۔ان اصولوں پر عمل کرنے کی وجہ سے ان کی تحقیق دیگر قدیم جدید محققین کی تحقیق سے مختلف ہوتی ہے۔"[اشاعۃ الحدیث،اشاعتِ خاص بیادزبیر علی زئی:۱۷۷]

قاضی شوکانی غیر مقلد کہتے ہیں:

"یہ حدیث حسن لغیرہ ہے جو جمہور کے ہاں قابلِ حجت ہے۔"

(نیل الاوطار۴/۲۸۱باب وجوب الحج بحوالہ مقالات اثریہ:۱۱۱)

شوکانی کی تصریح کے مطابق حسن لغیرہ حدیثیں جمہور کے ہاں حجت ہیں مگر علی زئی صاحب حسن لغیرہ کی حجیت کے منکر ہیں۔

چنانچہ صلاح الدین یوسف غیر مقلد نے زبیر علی زئی کے متعلق لکھا:

"انہوں نے (مروجہ) حسن لغیرہ کا انکار کر دیا اور یوں اس ایک اصول میں اختلاف کی وجہ سے ان کی روش دیگر محدثین سے مختلف ہوگئی۔"[اشاعۃ الحدیث،اشاعتِ خاص بیادزبیر علی زئی:۱۷۳]

(ہ)-غیر مقلدین احکام میں بھی محدثین سے اختلاف کیا کرتے ہیں جیسا کہ آگے حاشیہ :۵۴۸ میں آئے گا ان شاء اللہ۔

## ۵۴۶

علی زئی صاحب نے یہاں جمہور کے مقابلے میں قلیل گروہ کی پیروی کرنے والے کو باطل کہنے کی بجائے"مخطی،خطاکار"کہا ہے۔یہاں خطاء کی وضاحت کر دیتے تو اچھا ہوتا۔" رفعت عن امتی الخطاء و النسیان،میری امت سے خطاء ونسیان معاف ہے۔"والی خطاء مراد ہے یا کوئی اور؟

## ۵۴۷

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"**فَعَلٰی هٰذَا یَلْزَمُهٗ اَنْ یَّجْتَهِدَ فِیْ اخْتِیَارِ مَذْهَبٍ یُّقَلِّدُهٗ عَلَی التَّعْیِیْنِ**۔اسی وجہ سے ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ کوشش کر کے کوئی ایک مذہب اختیار کر لے پھر معین طور پر اُسی کی تقلید کرے۔"

[المجموع شرح المهذب للنووی:۱/۹۱]

امام نووی رحمہ اللہ نے حدیث کے جملہ"ائمہ کے ساتھ خیر خواہی" کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا:

"**وَاِنَّ مِنْ نَّصِیْحَتِهِمْ قُبُوْلَ مَا رَوَوْهُ وَتَقْلِیْدَهُمْ فِی الْاَحْکَامِ وَاِحْسَانَ الظَّنِّ بِهِمْ**،ان کی خیر خواہی یہ ہے کہ جسے انہوں نے روایت کیا ہے اسے قبول کیا جائے،احکام میں ان کی تقلید کی جائے

اوران کے ساتھ حسن ظن رکھا جائے۔ [شرح مسلم: ۱/۵۴ قدیمی کتب خانہ کراچی]

حاصل یہ ہے کہ امام نووی رحمہ اللہ تقلید کے قائل ہیں۔ علی زئی صاحب ایک طرف تو کہتے ہیں: ''ایک محدث بھی مقلد نہیں تھا'' [اوکاڑوی کا تعاقب صفحہ ۵۲] اور دوسری طرف تقلید کے قائل امام نووی رحمہ اللہ کو علمائے حدیث/محدثین کے تحت درج کرتے ہوئے لکھا:

''علمائے حدیث میں اختلاف رہا ہے۔ مثلاً: میت کو غسل دینے سے غسل کرنے والی حدیث کو ترمذی (۹۹۳) حسن اور ابن حبان (الاحسان: ۱۱۵۸) نے صحیح قرار دیا ہے، جب کہ نووی نے کہا: ''بل ھو ضعیف'' بلکہ وہ ضعیف ہے۔''

## ۵۴۸

(الف)- عمر فاروق قدوسی غیر مقلد (نائب مدیر مکتبہ قدوسیہ لاہور) لکھتے ہیں:

''یہ مسلک اہلِ حدیث ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی بڑی شخصیت کی رائے بھی دلائل کی بنا پر مسترد کی جاسکتی ہے۔'' [اشاعۃ الحدیث، اشاعتِ خاص بیادِ زبیر علی زئی: ۵۳۸]

علی زئی صاحب لکھتے ہیں:

''دلائل کے ساتھ اکابر علماء سے ادب واحترام کے ساتھ اختلاف کرنا جائز ہے''
[علمی مقالات: ۶/۵۸۵]

یہی بات ''اشاعۃ الحدیث، اشاعتِ خاص بیادِ زبیر علی زئی: ۴۴۳'' میں بھی منقول ہے۔

غیر مقلدین کی ان عبارات میں تصریح ہے کہ امتیوں سے اختلاف کرنا جائز ہے۔ اور یہ تو سب کو تسلیم ہے کہ محدثین بھی امتی ہی ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی محدثین سے اختلاف کرے تو غیر مقلدین کے ہاں یہ طرزِ عمل جائز ہے، انہیں اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

(ب)- علی زئی صاحب یہاں یہ بھی فرما دیتے کہ غیر مقلدین نے بھی محدثین کے ساتھ اختلاف کر رکھا ہے جن میں وہ خود بھی شامل ہیں۔

عمر فاروق قدوسی غیر مقلد نے علی زئی صاحب سے سعودیہ میں ہونے والی ایک ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا:

''اس مجلس میں انہوں نے چند مسائل میں اپنے موقف کا اظہار کیا جو کہ جمہور علماء اہلِ حدیث سے ہٹ کر تھا۔ ان کا ان مسائل کو احاطہ تحریر میں لانے کا ارادہ تھا۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کی: شیخ بلاشبہ

یہ آپ کی اپنی تحقیق ہے لیکن جب آپ کی طرف سے یہ موقف عوام کے سامنے آئے گا تو اس کے دو نقصان ہوں گے۔ ایک تو عامۃ الناس کے لیے اُلجھن پیدا ہوگی اور دوسرا وہ لوگ جو ہر وقت آپ کے تعاقب میں رہتے ہیں، انہیں اہلِ حدیث علماء کے باہمی علمی اختلاف کے اُچھالنے کا موقع ملے گا۔ آپ تو نیک نیتی سے اپنا موقف بیان کریں گے لیکن اس کا نقصان ہوگا۔ میں نے انہیں صلوٰۃ الرسول کی تخریج کی مثال بھی دی۔ انہوں نے میری بات سے اتفاق کیا۔ پاکستان آکر میں نے انہیں اس بارے میں ایک خط بھی لکھا۔ یہاں میں بصد احترام یہ بات عرض کروں گا اپنے محقق علماء کرام کی خدمت میں جو کہ مصنفین بھی ہیں، ضروری نہیں کہ ہر بات جو آپ کے نزدیک درست اور راجح ہو، وہ احاطہ تحریر میں بھی لائی جائے۔ بہت سی باتیں ہیں کہ خوف فساد خلق سے ناگفتہ رہ جاتی ہیں اور ان کا ناگفتہ رہنا ہی بہتر ہوتا ہے۔''

[ماہ نامہ اشاعۃ الحدیث خصوصی اشاعت، حافظ زبیر علی زئی: ۵۴۰]

مذکورہ عبارت میں لکھا ہے کہ ''انہوں نے چند مسائل میں اپنے موقف کا اظہار کیا جو کہ جمہور علماء اہلِ حدیث سے ہٹ کر تھا۔'' علی زئی سمیت غیر مقلدین اہلِ حدیث کا مصداق محدثین کو قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ علی زئی صاحب لکھتے ہیں:

''آج تک کسی مسلم عالم نے اس بات کا انکار نہیں کیا کہ ''**اھل الحدیث**'' سے مراد محدثین کی جماعت ہے۔'' (علمی مقالات: ۵/۱۲۵)

مذکورہ بالا عبارات کے مطابق علی زئی صاحب نے جمہور محدثین سے ہٹ کر موقف اختیار کیا۔

عمر فاروق قدوسی غیر مقلد (نائب مدیر مکتبہ قدوسیہ لاہور) لکھتے ہیں:

''علماء کے شاذ موقف ایک عام سی بات ہے۔ اس میں کسی مسلک کی تخصیص نہیں ویسے بھی جمہور سے اختلاف کا اپنا ہی مزا ہے۔ ہمارے ممدوح شیخ زبیر رحمۃ اللہ علیہ بھی چند مسائل شاذ موقف رکھتے تھے۔''

[اشاعۃ الحدیث، اشاعتِ خاص بیاد زبیر علی زئی: ۵۳۹]

محمد عزیز شمس غیر مقلد نے علی زئی صاحب کے بارے میں لکھا:

''احادیث کی تحقیق کے سلسلے میں انہوں نے بعض ایسے اُصول بنائے ہیں جو جمہور محدثین کے خلاف ہیں، جیسے احادیث پر حکم لگانے میں ظاہر سند کا اعتبار اور علل کی پروا نہ کرنا، راویوں پر جرح و تعدیل میں علماء و نقاد کی تعداد سامنے رکھنا، صحیح کے بار ہر مدلس راوی کا عنعنہ نا قابلِ قبول بنانا، معروف کتب حدیث و رجال (جو مختلف قرائن کی بنا پر ان کے مؤلفین سے ثابت ہیں) کے لئے ان کے مؤلفین تک صحیح سند سے

اتصال کا مطالبہ کرنا۔ ان اصولوں پر عمل کرنے کی وجہ سے ان کی تحقیق دیگر قدیم، جدید محدثین و محققین کی تحقیق سے مختلف ہوتی ہے۔'' [اشاعۃ الحدیث، اشاعتِ خاص بیادِ زبیر علی زئی: ۱۷۷]

عبدالعزیز نورستانی غیر مقلد (جامعہ اثریہ پشاور) علی زئی صاحب کے متعلق لکھتے ہیں:

''حافظ صاحب فن رجال میں تبحر کی بناء کچھ تفردات کے بھی حامل تھے۔''

[اشاعۃ الحدیث، اشاعتِ خاص بیادِ زبیر علی زئی: ۵۰۴]

محمد خبیب احمد اثری غیر مقلد نے علی زئی صاحب کے بارے میں لکھا:

''مصطلح الحدیث کے بعض مسائل میں ان سے شذوذ سرزد ہوئے۔ اگر یہ اُصول ان کی شخصیت تک محدود رہتے تو ہمیں بھی اعتراض نہ ہوتا کہ دیگر اہلِ علم کے شذوذ معروف ہیں۔ مگر جب انہوں نے اپنے اصولوں پر محدثین کے اُصول کا لیبل چسپاں کیا تو ہمیں بھی اظہارِ حق کے لئے قلم کو جنبش دینا پڑی، جس پر راقم الحروف کی کتاب ''مقالاتِ اثریہ'' کے صفحات گواہ ہیں۔''

[ہفت روزہ الاعتصام لاہور ۱۸ ربیع الثانی ۱۴۳۷ھ: ۱۴]

خبیب صاحب نے علی زئی صاحب کے متعلق مزید لکھا:

''اہلِ فن [محدثین (ناقل)] کی شاہراہ کو چھوڑ کر شذوذ کی پگڈنڈی پر گامزن ہو گئے۔''

[ہفت روزہ الاعتصام لاہور ۱۰ جمادی الاولی ۱۴۳۷ھ: ۱۵]

ارشاد الحق اثری غیر مقلد لکھتے ہیں:

''علامہ ابن الوزیر رحمہ اللہ نے خود اقرار کیا کہ تمام صحابہ کی عدالت کے بارے میں ہمارا محدثین سے اختلاف ہے۔'' [مقام صحابہ: ۹۵]

محدثین سے اختلاف کا اعتراف کرنے والے ابن الوزیر صاحب کو غیر مقلدین اہلِ حدیث کہا کرتے ہیں۔

عبدالحق غزنوی غیر مقلد اپنے رسالہ ''الاربعین'' کے تعارف میں لکھتے ہیں:

''رسالہ میں چالیس دلائل واضح ہیں اس باب کے ثبوت کے واسطے کہ ثناء اللہ امرتسری محدثین کے مذہب پر نہیں'' [الاربعین: ۳ مشمولہ رسائل اہلِ حدیث جلد اول]

یاد رہے کہ ثناء اللہ امرتسری صاحب کو غیر مقلدین شیخ الاسلام کہا کرتے ہیں اور یہ بزرگ علی زئی صاحب کے شیخ الشیخ یعنی دادا استاد ہیں۔

علی زئی صاحب نے کفایت اللہ سنابلی ہندی غیر مقلد کے متعلق لکھا:

’’سنابلی صاحب ایسے منہج پر گامزن ہیں، جس سے صحیح بخاری و صحیح مسلم کی احادیث کا ضعیف ہونا لازم آتا ہے۔‘‘ [علمی مقالات:۶/۳۹۲]

علی زئی صاحب آگے لکھتے ہیں:

’’سنابلی صاحب کو چاہیے کہ وہ تمنا عمادی اور بشیر احمد میرٹھی وغیرہما کی پگڈنڈیوں کو چھوڑ کر محدثین کرام کی جرنیلی شاہراہ پر گامزن ہو جائیں اور منکرین حدیث کے لیے چور دروازے نہ کھولیں۔‘‘ [علمی مقالات:۶/۳۹۳]

محدثین تقلید کے قائل ہیں، بعض محدثین کی عبارات تو خود علی زئی صاحب نے نقل کی ہیں جن میں تقلید کا ثبوت ہے۔ چنانچہ انہوں نے لکھا:

’’ابن الاصلاح (تقلیدی) نے عامی (مقلد) کے بارے میں لکھا ہے: ’’**فان کان شافعیا لم یکن لہ ان یستفتی حنفیا ولا یخالف امامہ**‘ پس اگر وہ شافعی ہے تو اسے حنفی سے مسئلہ نہیں پوچھنا چاہیے اور اپنے امام کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے۔‘‘ [علمی مقالات:۶/۱۵۴]

علامہ خطیب بغدادی رحمہ اللہ اور حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ نے عامی کے لیے تقلید کو جائز بتایا ہے۔ ان دونوں کی عبارات علی زئی صاحب کی کتاب ’’دین میں تقلید کا مسئلہ:۲۴‘‘ میں موجود ہیں۔

محدثین کے برخلاف علی زئی سمیت غیر مقلدین تقلید کی مذمت کیا کرتے ہیں۔

شرف الدین دہلوی غیر مقلد لکھتے ہیں:

’’محدثین کی طرف مجلس واحد میں تین طلاق کو ایک شمار کرنے کی نسبت میں بھی کلام ہے، یہ سخت مغالطہ ہے، اصل بات یہ ہے کہ صحابہ تابعین و تبع تابعین سے لے کر سات سو سال تک سلف صالحین و تابعین و محدثین سے تو تین طلاق کا ایک مجلس میں واحد شمار ہونا ثابت نہیں من ادعی فعلیہ البیان بالبرھان و دونہ خرط القتاد۔‘‘ [فتاویٰ ثنائیہ:۲/۲۱۷]

محدثین کے مسلک کے برعکس غیر مقلدین تین طلاق کو ایک کہا کرتے ہیں۔

علی زئی صاحب لکھتے ہیں:

’’صحیح بخاری میں ہے کہ ’’و صافح حماد بن زید ابن المبارک بیدیہ‘‘ اور حماد بن زید نے ابن المبارک سے دونوں ہاتھوں کے ساتھ مصافحہ کیا۔ (کتاب الاستیذان باب الاخذ بالیدین قبل ح

۶۲۶۵) لہٰذا اگر کوئی شخص دونوں ہاتھ سے مصافحہ کرتا ہے تو یہ بھی جائز ہے۔‘‘

[الحدیث شمارہ: ۱۸ صفحہ ۴ بحوالہ اشاعۃ الحدیث، اشاعتِ خاص بیادِ زبیر علی زئی: ۳۷۳]

دو محدثین/سیدنا حماد بن زید رحمہ اللہ اور سیدنا عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ کے برعکس عام غیر مقلدین کی رائے یہ ہے کہ دو ہاتھ سے مصافحہ کرنا حدیث کی خلاف ورزی ہے۔ اور حکیم محمد اسرائیل سلفی غیر مقلد نے تو یہاں تک لکھ دیا:

’’یہ... حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مذاق ہے۔‘‘

[التحفة الحسنى: ۳۸ بحوالہ بارہ مسائل: ۲۳]

غیر مقلدین کا ایک طبقہ داڑھی تراشنے کو ناجائز کہتا ہے اگرچہ مٹھی سے زائد حصہ ہی تراشا جائے۔ علی زئی صاحب غیر مقلدین کے اس گروہ کو صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور محدثین کا مخالف بتاتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

’’کسی صحابی سے سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ پر اس سلسلے میں انکار ثابت نہیں ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جیسے متبع سنت صحابی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سنیں اور پھر خود ہی اس کی مخالفت بھی کریں... مسئلہ یہ نہیں کہ صحابی کا عمل دلیل ہے یا نہیں؟ بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ قرآن و حدیث کا کون سا فہم معتبر ہے۔ وہ فہم جو چودہویں صدی ہجری کا ایک عالم پیش کر رہا ہے یا وہ فہم جو صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور محدثین کرام سے ثابت ہے؟!‘‘

[الحدیث حضرو شمارہ: ۲۷ صفحہ ۵۶ بحوالہ اشاعۃ الحدیث، اشاعتِ خاص بیادِ زبیر علی زئی صفحہ ۳۷۵]

یہاں یہ بھی جانتے چلیں کہ غیر مقلدین نے محدثین کی مخالفت پر باقاعدہ ایک جماعت تشکیل دی ہے۔ چنانچہ پروفیسر مبارک غیر مقلد لکھتے ہیں:

’’جماعت غرباءِ اہلِ حدیث کی بنیاد صرف محدثین کی مخالفت پر رکھی گئی تھی، صرف یہی مقصد نہیں بلکہ تحریک مجاہدین یعنی سید احمد بریلوی کی تحریک کی مخالفت کر کے انگریز کو خوش کرنے کا مقصد پنہاں تھا۔‘‘

[علمائے احناف اور تحریک مجاہدین: ۴۸]

(جاری ہے۔۔۔)



یا اللہ مدد | شانِ رسالت زندہ باد | عقیدۂ حیات النبی زندہ باد | اصلی کلمۂ اسلام لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ | مقامِ صحابہؓ زندہ باد | مقامِ امامِ اعظم ابوحنیفہؒ زندہ باد | حق چار یارؓ

# قائد اہل سنت وکیل صحابہؓ حضرۃ مولانا قاضی مظہر حسین نوراللہ مرقدہ کے خلیفہ مجاز

جانشین قائد اہل سنت بقیۃ السلف

جامع شریعت وطریقت

## حضرۃ مولانا شیخ الحدیث حبیب الرحمٰن سومرو صاحب مدظلہ

## کے بیانات

| وقت | مقام | مؤرخہ | شمار |
| --- | --- | --- | --- |
| | سالانہ جلسہ، جامعہ مظہریہ حسینیہ، جہان سومرو | ۹/فروری بدھ | ۱ |
| بعد ظہر | سالانہ جلسہ مدرسہ حیات النبی ٹمن تلہ گنگ | ۱۳/فروری اتوار | ۲ |
| بعد عشاء | مکی مسجد، چکوال | ۱۳/فروری اتوار | ۳ |
| بعد مغرب | جامع مسجد فاروق اعظم، چک عمراء، چکوال | ۱۴/فروری پیر | ۴ |
| بعد ظہر | راولپنڈی | ۱۵/فروری منگل | ۵ |
| | سالانہ جلسہ، امدادیہ مسجد، پنڈی روڈ، چکوال | ۱۶/فروری بدھ | ۶ |
| بعد مغرب | مرکزی مدینہ مسجد، بھون، چکوال | ۱۷/فروری جمعرات | ۷ |
| خطبہ جمعہ | مدنی جامع مسجد، چکوال | ۱۸/فروری جمعہ | ۸ |
| بعد مغرب | جامع مسجد حق چار یار، تلہ گنگ | ۱۸/فروری جمعہ | ۹ |
| | سالانہ جلسہ جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام، جہلم | ۱۹/فروری ہفتہ | ۱۰ |